زندگی کا بازار

(مابعد جدید افسانوں کا انتخاب)

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری

مرتب: انور مرزا

افسانہ پبلی کیشن

تھانے۔ مہاراشٹر

زندگی کا بازار

(مابعد جدید افسانوں کا انتخاب)

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری

مُرتّب : انور مرزا

افسانہ پبلی کیشن

تھانے۔ مہاراشٹر

زندگی کا بازار

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری

کے مابعد جدید افسانے

مُرتب : انور مرزا

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۲

© Dr. Reyaz Tawheedi Kashmiri

ZINDAGI KA BAZAR (Short Stories)
By : Dr. Reyaz Tawheedi Kashmiri
Compiled By : Anwar Mirza
Afsana Publication,
(Thane) Maharashtra, India
1st Edition : March 2024
Printer : Chitra Printing Press, Bhayandar - Thane
ISBN : 978-81-19889-51-8

9788119889518

اِس کتاب کا کوئی بھی حصہ مصنف یا ناشر کی پیشگی اجازت کے بغیر کسی بھی وضع یا جلد میں کُلّی یا جزوی، منتخب یا مکرر اشاعت یا بہ صورت فوٹو کاپی، ریکارڈنگ، الیکٹرانک، میکینیکل یا ویب سائٹ پر اپ لوڈنگ کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ نیز اِس کتاب پر کسی بھی قسم کے تنازعہ کو نمٹانے کا اختیار صرف ممبئی (انڈیا) کی عدلیہ کو ہوگا۔

کتاب میں شامل افسانوں کے سبھی کردار، واقعات اور موضوعات فرضی ہیں۔ کسی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہوسکتی ہے، جس کے لئے مصنف یا ناشر ذمہ دار نہیں ہوگا۔

کتاب کا نام : زندگی کا بازار
مُصنّف : ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری
موبائل : +91 9906834877
مُرتّب : انور مرزا
نوعیت : فِکشن (افسانے)
سرورق : انور مرزا/Nanne Tiggelman
اشاعتِ اوّل : مارچ ۲۰۲۴ء
مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔٦

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
H.O. D1/16,Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002(INDIA)
B.O. 3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph: 011-41418204,45678286,45678203 ,23216162
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
www.ephbooks.com:website

انتساب

نئی نسل

کے

اُردو

قارئین

کے

نام

فہرست

اظہارِ مسرت ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری	05

افسانے	صفحہ نمبر
۱۔ سفید نُور کا راز	07
۲۔ پوش کالونی کے ویران کھنڈر	12
۳۔ ڈیوڈ سیارہ	23
۴۔ ایکٹولائف	27
۵۔ گلوبل جھوٹ	35
۶۔ سنگ باز	39
۷۔ گمشدہ سرمایہ	43
۸۔ سفید ہاتھی	47
۹۔ ناکہ بندی	51
۱۰۔ جشنِ قبرستان	55
۱۱۔ ٹوٹتی جوانیاں	59
۱۲۔ ڈپریشن	63
۱۳۔ ہوم لینڈ	67
۱۴۔ ببول کے کانٹے	73
۱۵۔ کشمیر نواز	76
۱۶۔ کبھی الوداع نہ کہنا	79
۱۷۔ اپنا سورج	83
۱۸۔ کالے پیڑوں کا جنگل	86
۱۹۔ کالی دھند اور سفید کبوتر	89
۲۰۔ عید مبارک	94
۲۱۔ تاج محل اور گئو شالہ	99
۲۲۔ جنت کی چابی	105

افسانے	صفحہ نمبر
۲۳۔ پھول اور خوشبو	115
۲۴۔ ہائی جیک	122
۲۵۔ زندگی کا بازار	125
۲۶۔ کالے دیوؤں کا سایہ	130
۲۷۔ گمشدہ قبرستان	134
۲۸۔ ناقوس واذان	139
۲۹۔ مِشن القدس	146
۳۰۔ دوشالہ	151
۳۱۔ رحمت کے پھول	156
۳۲۔ گُلہ قصائی	161
۳۳۔ سفید جنگ	166
۳۴۔ کالے دیوؤں کی واپسی	171
۳۵۔ دردِ کشمیر	176
۳۶۔ اصلی روشنی	180
۳۷۔ مشترکہ میراث	189
۳۸۔ کالا چوہا	197
۳۹۔ ماحول بچاؤ	202
۴۰۔ کبوتر اور سانپ	205
۴۱۔ وفادار پیڑ	207
مابعد جدید دور کا نمائندہ افسانہ نگار: توحیدی پروفیسر قدوس جاوید	211

اظہارِ مسرت

عجیب حیرت بکھیرتے تھے وہ داستان گو
کہ شب نے جانے سے صاف انکار کر دیا

(صابر وسیم)

یہ جان کر مسرت ہو رہی ہے کہ اردو ادب کے مخلص خادم اور ماہر افسانہ انور مرزا (ممبئی) راقم کے چند افسانوں کا انتخاب سامنے لا رہے ہیں۔ راقم کو موصوف نے ہی اس جانب توجہ مبذول فرمائی اور کتاب شائع کرنے کی حامی بھی بھر لی۔ جس کے لئے میں ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

قریباً پچھلے پچیس برسوں سے میرے افسانے مختلف رسائل وجرائد، اخبارات اور سوشل میڈیائی ادبی فورمز پر شائع ہوتے آئے ہیں اور میرا پہلا افسانوی مجموعہ ''کالے پیڑوں کا جنگل'' 2011ء میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ اس کے بعد دوسرا مجموعہ ''کالے دیوؤں کا سایہ'' 2014ء میں شائع ہوا تھا۔ پھر دونوں مجموعوں کا دوسرا مجلد ایڈیشن 2019ء میں میزان پبلشرز بٹہ مالو سرینگر نے خود شائع کیا تھا۔ تیسرا مجموعہ ''تاج محل اور گئو شالہ'' زیرِ ترتیب ہے۔ اس مجموعے کے بیشتر افسانے رسائل اور سوشل میڈیائی فکشن فورمز پر آ چکے ہیں

جنہیں قارئین نے اپنے زریں خیالات سے نوازا ہے۔اب جو انتخاب سامنے آرہا ہے اس میں پہلے دو مجموعوں اور زیر ترتیب تیسرے مجموعے سے بھی منتخب افسانے شامل ہیں۔

امید ہے، قارئین کرام اس کتاب کو پڑھ کر ادبی لطافت سے محظوظ ہوں گے اور افسانوں سے بھی لطف اٹھائیں گے۔ان افسانوں کے مختلف موضوعات ہیں یعنی کشمیر سے لے کر ملکی اور عالمی سطح تک کے موضوعات کی کہانیاں پڑھنے کو ملیں گی۔جن میں بیشتر مابعد جدید دور کے موضوعات سے متعلق ہیں۔باقی معزز قارئین کے ذوق مطالعہ پر ہی چھوڑنا مناسب رہے گا کہ فنی، تکنیکی، لسانی، تخلیقی اور موضوعاتی طور پر یہ کس نوعیت کے افسانے ہیں۔

شکریہ

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری

drreyaztawheedi777@yahoo.com

Wadipora Handwara, Kashmir

سفید نُور کا راز

اُس کی بصارت مانوس روشنی کو صرف محسوس کر سکتی تھی۔ وہ اس روشنی کے اصل راز کو پانا چاہتا تھا' جس کے بارے میں کئی لوگ بے چین ہوتے آئے تھے کہ یہ کہاں سے پھوٹ پڑی ہے اور کہاں پر سیاہ پڑ جائے گی۔ اس نے فلسفہ اور سائنس میں یہ راز کھوجنے کی کوشش کی' لیکن وہاں پر صرف استدلال اور تجربے کا ہی چکرویو نظر آیا۔ وہ یہ سمجھنے سے بھی قاصر تھا کہ اصلی راز ہے کیا..؟ یہ روشنی یا میرا وجود.. میرا وجود یا میری روح؟ کیونکہ ہر ذی روح کا احساس روشنی کو تو محسوس کر سکتا ہے' تاہم' اس راز کو محسوس کرنے کا اپنا ہی ایک خودکار نظام ہے جو حیات کے نقار خانے میں تو سنائی دیتا ہے' لیکن صرف محسوس کیا جا سکتا ہے' چھوا نہیں جا سکتا۔ روشنی کے اس احساس کا بھی اپنا ایک انوکھا سفر رہا ہے۔ کبھی یہ نقار خانے کے پرندے کے لئے چند لمحات کا ہی ثابت ہوتا ہے' کبھی طلوعِ حیات سے لے کر غروبِ حیات تک محیط ہوتا ہے اور کبھی کسی بدنصیب پرندے کی آنکھوں کے لئے پوشیدہ ہی رہتا ہے' کیونکہ وہ محسوس کرنے کی حِس سے عاری ہوتا ہے۔ اُس کی بصارت کا طویل سفر اب بصیرت کی جانب بڑھ رہا تھا۔

ایک منزل ایسی بھی آئی جب بصارت کے آئینے میں بصیرت کے احساس کا عکس ابھرنے لگا۔ سیال سوچ' ٹھوس احساس میں کروٹ لینے لگی۔ مشاہدات کو تجربات کی کسوٹی پر پرکھنے کا مجاہدہ شروع ہوا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہر شئے کی پہچان متضاد سے ہی ہو سکتی ہے۔ سوچ نے اندھیرے میں جست لگائی تا کہ روشنی کی سیال کیفیت ٹھوس پیکر میں سامنے آئے۔ آئینے نے اس کے عکس کو مشاہدات کے عالم میں پہنچا دیا۔ وہ جب

اندھیرے میں بھٹکنے لگا تو فکر کی شمع نے نور کی کرنیں بکھیر دیں۔اس نے ہر طرف نظریں دوڑائیں۔

ہر مقام پر تدبر کے پہاڑ نظر آئے۔وہ بہت دیر تک تدبر کے پہاڑوں کو حیرانی سے تکتا رہا۔مشاہدات کا سلسلہ شروع ہوا۔اس کے قدم آگ والے گروہ کی جانب بڑھ گئے۔آگ کے پہاڑ شعلے برسا رہے تھے۔شعلوں کے ارد گرد کئی عمر رسیدہ لوگ آنکھیں بند کر کے گیان کی وادیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

وہ بھی آنکھیں بند کر کے کافی دیر تک ادراک کی وادیوں میں بھٹکتا رہا۔

ایک میٹھی آواز سے دماغ جاگ اٹھا:

''منش کیا ڈھونڈ رہا ہے؟'' ایک سفید بالوں والے گیانی کی آواز آئی۔

''ایک راز کی تلاش۔'' اس نے گیانی کے پرسکون چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کونسا راز ابھی تک پوشیدہ ہے؟'' گیانی کی آنکھیں بھی اس کے چہرے کو سوالیہ انداز سے تکنے لگیں۔

''وہ راز جو خود تو روشن ہے لیکن اپنے روشن ہونے کا راز چھپائے بیٹھا ہے۔''

''اس کو پانے کے لئے من کی تپسیا کی ضرورت ہے۔''

''تپسیا کے لئے کون سی مشقت ضروری ہے؟''

''نفس کشی کی ریاضت۔''

''اس کا طریقہ کیا ہے؟''

''فریب کی پہچان۔''

''فریب کی پہچان کیا ہے؟''

''مایا جال سے مکتی۔''

''مکتی کا نشان کیا ہے؟''

''انا کی موت۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''احساس کی موت سے۔''

''احساس کی موت کے بعد راز کہاں کھلے گا؟''

''یہ تیرا دھوکہ ہے۔''

''نہیں یہی حقیقت ہے...!''

یہی حقیقت کہتے کہتے گیانی نے دوبارہ آنکھیں بند کیں اور اپنے گیان میں کھو گیا۔ وہ تھوڑی دیر وہاں گم سم بیٹھا رہا۔ اس کی سوچ پر من کی تپسیا' نفس کشی' فریب' مایا جال' مکتی' 'انا کا خاتمہ' اور 'احساس کی موت' جیسے وجودی گیان کی پہیلیاں چھائی رہیں۔ وہ حقیقت کا احساس کر کے سوچنے لگا کہ وہ تو راز کی کھوج میں کسی اور راز کے جنگل میں پھنسا جا رہا ہے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی نظر دوسرے گروہ پر پڑی۔ فکر کا گھوڑا اس جانب بڑھنے لگا اور آنکھیں کاغذ قلم سنبھالے چہروں پر جم گیں۔

لکھنے والا ہاتھ لگاتار لکھ رہا تھا اور لکھنے والے کی زبان پر 'کیوں...؟ کب... کیسے...؟' ہاں اور نہیں کے منفی، مثبت لفظوں کی گردان جاری تھی۔

وہ یہ دیکھ کر سامنے بیٹھے متفکر چہرے والے آدمی سے پوچھ بیٹھا:

''یہ کونسا عالم ہے؟''

مفکر کی سماعت سے جب یہ دلچسپ آواز ٹکرائی تو اس کی آنکھوں میں چمک سی عود آئی اور وہ منطقی انداز سے گویا ہوا۔

''یہ تفکرات کا عالم ہے۔''

''تفکرات کا عالم...؟'' وہ حیران ہو کر بول پڑا۔ ''یہ کس طرح وجود میں آتا ہے۔''

''یہ عقل کے گھوڑے دوڑانے سے وجود میں آتا ہے۔'' بوڑھے فلسفی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ ہر راز کی کھوج لگا سکتا ہے؟''

''اس کا کام ہی کھوج لگانا ہے۔''فلسفی قلم کو دوات میں ڈبوتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تمہیں کس راز کی تلاش ہے۔؟''

''مجھے سفید راز کی تلاش ہے؟''

''سفید راز کی تلاش؟''فلسفی حیرانی سے پوچھ بیٹھا۔

''ہاں' مجھے روشنی کے راز کی تلاش ہے۔''

''اچھا' روشنی کے راز کی تلاش..!''فلسفی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بول پڑا۔''یہ اصل کی نقل ہے۔''

''اصل کی نقل؟''اُس کے منہ سے نکل پڑا۔''میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''یہیں سے ایک فلسفی اور عام آدمی کی عقل میں فرق واضح ہوجاتا ہے۔''فلسفی آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بول پڑا۔''اصل نور ہے اور یہ روشنی اس کی نقل ہے۔''

''لیکن اس کا ظہور کیا ہے اور خاتمہ بھی ہے کہ نہیں؟

''یہ گردش کا سفر ہے جو مسلسل جاری رہتا ہے۔''

''پھر تو یہ اصل ہے نقل کہاں؟''

''بس اتنا ہی سمجھو جتنا عقل سمجھاتی ہے۔''

یہ فلسفیانہ مکالمہ ہونے کے بعد وہ تذبذب کے عالم سے یہ کہتے ہوئے نکل پڑا کہ یہ عالم بھی عقل کا ہی اسیر ہے۔اس لئے یہاں پر بھی شک اور یقین کی رسہ کشی ہی جاری ہے۔اس نے دوبارہ اپنی نظروں کو چہار جانب گھمایا۔

کئی اور گروہ بھی عازم سفر نظر آئے لیکن اس کی نظریں سب سے آخری جماعت پر ٹھہر گئیں۔احساس کا پرندہ امید وبیم کی اڑان بھرتے ہوئے وہاں کی پُرسکون فضا میں پرواز کرنے لگا۔کچھ لوگ عبادت کرنے میں مشغول تھے اور باقی لوگ ایک نورانی چہرے والے بزرگ کے شگفتہ لفظوں کی تاثیر سے اپنے احساسات کو مہکا رہے

تھے۔ روحانی پیام عالم اکبر اور عالم اصغر کے خالق کی خوشبو سے فضا کو خوشگوار کر رہا تھا:

''اُس مالک دو جہاں کا نور ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔ ہر شئے میں اسی نور کا ظہور ہے۔ اس دیدہ عالم کی روشنی نادیدہ عالم میں تبدیل ہو جائے گی پھر نا تمام والا نور پھیل جائے گا۔ یہاں کا زمانہ بھی نور ہے اس لئے زمانے سے محبت کرو کیونکہ زمانے کا خالق لازوال نور ہے۔''

روحانی پیغام نے مادّی اوہام پر غلبہ پالیا۔

بے قرار وجود میں قرار کی مٹھاس سما گئی۔

شک و یقین کی رسہ کشی ختم ہوئی اور وہ آنکھیں بند کر کے اطمینان کی گہرائیوں میں کھو گیا' کیونکہ دل نے سفید نور کے ظہور کا راز پالیا تھا۔

○○○

پوش کالونی کے ویران کھنڈر

وہ ایک معروف پروفیسر تھا۔اس کی شہرت کے چرچے نہ صرف ملک بلکہ بیرونِ ملک میں بھی ہوتے تھے۔اس کی تحریریں بطور ریفرنس پیش کی جاتی تھیں اوراس کے کئی مقالے عالمی سطح کے رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے تھے۔ماہرِ سماجیات ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بطورِ محقق بھی کافی مشہور تھا۔ نئے اسکالرز کی کتابوں اور پروجیکٹوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہوتا جس میں اس کا حوالہ نہ شامل ہو۔اسے کئی اعزازات سے بھی نوازا گیا تھا۔اب جبکہ ضعیف العمری کی وجہ سے وہ کم ہی گھر سے نکلتا تھا' تاہم کبھی کبھی اہم سمیناروں میں اسے ضرور بلایا جاتا اور وہ بھی حاضر ہوتا رہتا۔اپنی تقریر میں متعلقہ موضوع پر مدلل روشنی ڈالتا اور سامعین بھی معلومات سے محظوظ ہوتے۔

ہم دو ساتھی ایک سماجی پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے۔یہ پروجیکٹ ہمیں ایک این۔جی۔او کی طرف سے ملا تھا۔ یہ پروجیکٹ مابعد جدید سماج کی زندگی اور انسان کا سکون کے موضوع پر تیار کرنا تھا۔ پہلے ہم لوگ یونیورسٹیوں اور سرکاری وغیر سرکاری کتب خانوں میں پروجیکٹ سے متعلق ضروری مواد جمع کرتے رہے۔اس کے بعد فیلڈ ورک کے ساتھ ساتھ مختلف شخصیات سے بالمشافہ ملاقات اور انٹرویوز کا سلسلہ چل پڑا۔اس دوران جتنے بھی ماہرین سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ان میں سے بیشتر نے اپنی معلومات اور تجربات کے علاوہ مذکورہ پروفیسر سے رابطہ کرنے کا مشورہ ضرور دیا۔اس طرح سے ہمارے اندر پروفیسر صاحب سے ملنے کا شوق روز بہ روز بڑھتا ہی چلا گیا۔ پروفیسر صاحب سے ملنا ہمارا شوق بھی تھا اور ضرورت بھی' کیونکہ موصوف نہ صرف متعلقہ موضوع

پر ایک اتھارٹی تھے بلکہ ان کے کتب خانے میں اہم کتابوں کا ذخیرہ ملنے کا امکان بھی تھا۔

ایک دن انہیں یونیورسٹی کے ایک سمینار میں مدعو کیا گیا۔ ہم بھی پہلی بار ان کے کلیدی خطبے سے محظوظ ہوئے۔ سمینار کے بعد ہم لوگ ان کے پاس گئے اور اپنا مدعا پیش کیا۔ انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے ہماری بات سنی اور اپنا موبائل نمبر بھی سیو کروایا کہ جب بھی آنا ہو تو پہلے کال کر کے مطلع کریں۔ کئی مہینوں تک ہم فیلڈ ورک میں مصروف رہے کیونکہ ہمیں شہروں کے علاوہ قصبہ جات کے ساتھ ساتھ دیہاتوں سے بھی معلومات اکٹھا کرنا تھیں، اس لئے بہت ساری جگہوں کے چکر کاٹنے پڑے۔ سروے کے دوران ہم نے پایا کہ شہر یا قصبوں کے برعکس دیہاتوں میں ابھی بھی مشترکہ خاندانی نظام موجود ہے اور وہ لوگ بڑی خوشحال زندگی بھی گزار رہے ہیں۔ کئی جگہوں پر ہم نے ایک ہی گھر میں بیس سے لیکر تیس تیس لوگ اکٹھا رہتے دیکھے اور ہر ایک کی زبان پر گھر کے بزرگوں کی تعریفیں سنیں۔ جب ہمارے پاس کتب خانوں اور دیگر ذرائع سے بہت حد تک مواد جمع ہو گیا تو پروفیسر صاحب سے ملنے کا مشورہ ہوا۔ پروفیسر صاحب سے اتنے دنوں کے بعد ملنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ان کے ساتھ ایک ہی ملاقات میں کام نہیں چلے گا بلکہ ہمیں بار بار ان کے مشوروں اور راہنمائی کی ضرورت پڑے گی۔

ایک دن صبح سویرے میں نے پروفیسر صاحب کو فون کیا۔ کال ریسیو کرنے کے بعد سلام دعا کے ساتھ ہی میں نے اپنا تعارف دیا اور ملاقات کا بھی پوچھا۔ پہلے وہ چند لمحات تک سوچتے رہے اور پھر پوچھ بیٹھے کہ مجھے یاد نہیں آرہا ہے تو میں نے جب سمینار کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے پروجیکٹ کے بارے میں بتایا تو وہ 'ہاں ہاں یاد آیا' کہتے ہوئے ہنس پڑے اور ملاقات کا وقت بھی دے دیا۔ دوپہر کے وقت ہم لوگ پوش کالونی پہنچے اور پروفیسر صاحب کے گیٹ پر موجود بیل بجائی۔ چند لمحات کے اندر گیٹ کھل گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک نوجوان نے پُرتپاک انداز سے ہمارا خیر مقدم کیا اور اپنے ساتھ پروفیسر صاحب کے کمرے کی طرف لے گیا۔ چلتے چلتے دائیں جانب سے ایک کتے کے

غرانے کی آواز بھی سنائی دی۔شاید اس نے اجنبیوں کو دیکھ کر اپنی وفاداری کا اظہار کر دیا۔شکل وصورت اور آواز سے کتا بدیسی لگ رہا تھا۔ہم جب پروفیسر صاحب کے کمرے کے پاس پہنچے تو کتا ہم سے پہلے ہی کمرے میں گھس گیا۔پروفیسر صاحب کرسی پر بیٹھے تھے۔ہمیں دیکھ کر وہ پُرمسرت انداز سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ ملاتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ہم بھی شکریہ کرتے ہوئے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔سامنے میز پر چند کتابیں، قلم کاغذ اور لیپ ٹاپ تھا۔کمرے کی کھڑیاں خوبصورت پردوں سے سجی تھیں۔کمرے میں ایک لائبریری بھی تھی۔اس کے علاوہ دیوار پر فریم میں چند تصویریں تھیں جن میں پروفیسر صاحب کے ساتھ ایک عورت اور دو بچوں کے مسکراتے چہرے نظر آرہے تھے۔اسی دوران ایک بزرگ خاتون بیساکھی کے سہارے کمرے میں داخل ہوئی اور کیا حال ہے بچو کہتی ہوئی صوفہ پر بیٹھ گئی۔خاتون کو دیکھ کر ہم نے دوبارہ تصویر کی طرف دیکھا۔اس سے پہلے ہم کچھ کہتے پروفیسر صاحب بول پڑے کہ یہ میری بیوی ہے۔یہ بھی لیکچرر تھی۔ایک دن باتھ روم میں اسے چوٹ لگی تب سے بیساکھی کے سہارے چلتی پھرتی ہیں۔یہ سن کر بزرگ خاتون مسکراتے ہوئے ہماری طرف دیکھنے لگی اور پوچھ بیٹھی کہ آپ لوگ کس پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔یہ سن کر ہمیں محسوس ہوا کہ پروفیسر صاحب نے ہمارا ذکر گھر میں کیا ہے۔ہم نے جب پروجیکٹ کی تھوڑی بہت جانکاری دے دی تو نوجوان بھی چائے لیکر دوبارہ حاضر ہوا۔چائے پینے کے دوران پروفیسر صاحب کی بیوی نے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ نذیر بیٹا ہماری دل سے خدمت کرتا ہے۔کئی برسوں سے ہمارے گھر میں ہے۔یہ گاوں کا رہنے والا ہے لیکن لگتا ہے کہ اب ہمارے ہی گھر کا فرد ہے۔پہلے اس کا باپ ہمارے ہاں کام کرتا تھا پھر جب وہ بوڑھا ہو گیا تو انہوں نے اسے ہمارے گھر پر یہ کہتے ہوئے چھوڑا کہ مالک اور مالکن کی خدمت اپنے والدین کی طرح کرتے رہنا اور یہ لڑکا برابر باپ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ہماری خدمت کرتا رہتا ہے۔تعریفیں سن کر نذیر کا سینہ چوڑا ہو گیا اور

وہ مسکراتے ہوئے کیتلی اور پیالیاں اٹھا کر لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی پروفیسر صاحب بھی نذیر کی ستائش کرتے ہوئے بولے کہ ہاں میری بیوی صحیح کہتی ہیں۔ نذیر دل و جان سے ہماری خدمت کرتا ہے۔ ہم میں سے اگر کوئی تکلیف میں ہو تو یہ اپنی اولاد کی طرح تڑپ اٹھتا ہے۔ کبھی کبھی ہمیں ایسا لگتا ہے کہ یہ ہمارا خدمت گار نہیں بلکہ اپنا بیٹا ہے اور سچ بھی یہی ہے اپنا وہی ہوتا ہے جو اپنائیت اور محبت سے پیش آئے۔

کئی اور باتیں ہونے کے بعد بنیادی موضوع کی بات چھڑ گئی۔ پروفیسر صاحب پوچھ بیٹھے کہ اچھا منظور صاحب اب آپ مجھے بتائیں کہ پروجیکٹ کا کام کہاں تک پہنچا۔ آپ لوگوں نے اس دن کہا تھا کہ پہلے ہم ضروری مواد اور ڈاٹا جمع کریں گے۔ اب تو بہت عرصہ ہو گیا۔ میرے خیال میں بہت کچھ جمع ہوا ہوگا۔ پہلے مجھے تفصیل دکھائیں اگر بنائی ہے تاکہ میں بھی کچھ سمجھ سکوں کہ آپ لوگ کہاں تک پہنچے ہیں۔ یہ سن کر میری دوسری ساتھی زاہدہ نے بیگ سے کاغذات نکالے اور ہم لوگ بالتفصیل تحقیقی مشق اور جمع شدہ مواد کے بارے میں بتاتے رہے۔ اسی دوران پروفیسر صاحب کی بیوی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تقریباً تین گھنٹے تک پروفیسر صاحب کاغذات دیکھتے رہے اور ہماری تحقیقی کاوشوں کا جائزہ لیتے رہے۔ پورا جائزہ لینے کے بعد پروفیسر صاحب نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس پروجیکٹ پر آپ لوگوں نے کافی ہوم ورک کیا ہے۔ اب جو کچھ ضرورت پڑے گی تو اس سے متعلق آپ کو میری لائبریری سے مواد مل سکتا ہے اور باقی کام بھی ہوتا رہے گا۔ اہم چیز فیلڈ ورک ہے جو آپ لوگوں نے بخوبی انجام دیا ہے۔ پروفیسر صاحب کی حوصلہ افزائی سے ہماری ہمت بندھ گئی۔ چند اہم ہدایات سے نوازنے کے بعد پروفیسر صاحب فرمانے لگے کہ آپ لوگوں کی محنت' قابلیت اور زندہ دلی دیکھ کر دل خوش ہوا' اس لئے آپ لوگ کبھی اور کسی بھی وقت بلا تکلف یہاں آسکتے ہیں اور آنا تو ضرور ہوگا کیونکہ یہ آپ لوگوں کی مجبوری بھی ہے لیکن پہلے فون پر رابطہ کرتے رہنا۔ یہ سن کر ہم لوگ مسکرا اٹھے اور شکریہ ادا کرنے کے ساتھ وہاں سے نکل گئے۔

گیٹ سے نکلنے کے بعد ہم نے کالونی پر ایک سرسری نظر دوڑائی۔ ہر طرف کئی کئی منزلوں کے محل نما خوبصورت مکانات نظر آئے۔ لیکن اتنی خوبصورت کالونی کا ماحول جنگل کے سناٹے جیسا محسوس ہوا۔ کیونکہ بستی کی چھل پہل کہیں سے بھی نظر نہیں آئی۔ تھوڑا چلنے کے بعد ایک خوبصورت پارک پر نظر پڑی۔ وہاں کے بنچوں پر چند بزرگ محوِ گفتگو نظر آئے۔ کچھ اونگھ بھی رہے تھے۔ پارک میں موجود لوگوں کو دیکھ کر زاہدہ بولی کہ چلو ان کے ساتھ تھوڑی بہت بات کریں۔ میں نے انکار کرتے ہوئے بتایا کہ پھر کبھی دیکھیں گے لیکن باہمی مشورے کے بعد پارک کی طرف چل پڑے کہ کسی نہ کسی بزرگ سے بات ہو جائے اور پروجیکٹ سے متعلق کچھ جانکاری بھی مل سکے۔ جب ہم پارک میں داخل ہو گئے تو بزرگ لوگ ہمیں دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ پتہ نہیں انہوں نے کیا سمجھا لیکن جب ہم ان کے قریب پہنچے تو وہ ایک دوسرے کے چہروں کو استفہامیہ نظروں سے تکنے لگے۔ جب علیک سلیک ہونے کے ساتھ ہم نے اپنا تعارف کرایا تو ان لوگوں کی حیرت دور ہو گئی اور بات چیت کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ ہم نے بیٹھتے ہی پارک کا ایک جائزہ لیا۔ کئی لوگوں کے علاوہ چند کتے بھی درختوں کے سایوں میں گم سم بیٹھے تھے۔ بیشتر کتے بدیسی نسل کے لگ رہے تھے اور ہر ایک کے گلے میں زنجیر کے ساتھ ساتھ پٹا بھی لگا ہوا تھا جس پر کتوں کے نام کے ساتھ انسانوں کے نام بھی رقم تھے۔ میں نے جب اپنے پروجیکٹ کے حوالے سے بات شروع کی، اس کے مقاصد پر مختصر روشنی ڈالی اور ساتھ ہی پروفیسر صاحب سے ملاقات کے بارے میں بتایا تو ان میں ایک بزرگ، جس کی داڑھی اور سر کے بال پورے سفید ہو چکے تھے، نے اپنا تعارف بطور سبکدوش ایگزیکٹیو انجینئر دینے کے ساتھ ساتھ ہنستے ہوئے کہا کہ اچھا آپ اپنے پروفیسر گلشن صاحب کی بات کر رہے ہیں۔ وہ بھی تو اپنی برادری کے آدمی ہیں اور یہاں پر اکثر آتے رہتے ہیں۔ بھئی ان کی ایک خوبی تو دل چھو لیتی ہے کہ جب بھی کسی سوشل ایشو پر گفتگو کرتے ہیں تو ہم لوگوں کے علم میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور تھوڑی دیر تک راحت کی

سانس بھی لیتے ہیں۔ یہ سن کر ایک بار پھر ہمارے دلوں میں پروفیسر صاحب کی قابلیت اور عزت کا گراف بلند ہوا۔ اب ہم نے پہلے انجینئر صاحب سے ہی گفتگو کا سلسلہ شروع کیا کہ آپ لوگ پوش کالونی کے مکین ہیں تو ظاہر سی بات ہے کہ آپ لوگوں کی زندگی خوشحال ہوگی، یہاں پر زندگی کی جدید سہولیات دیکھ کر لوگ پوش کالونیوں میں گھر بنانے کی تمنا کرتے ہیں۔ پہلے انجینئر صاحب اور دوسرے لوگ یہ سن کر مسکرائے پھر انجینئر صاحب نے بڑے فخر سے کہا کہ جی آپ صحیح فرماتے ہیں کہ ایسی کالونیاں جدید سہولیات کا نمونہ ہوتی ہیں اور یہاں پر کم آمدن والے لوگ گھر بنانا تو کیا زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تک خریدنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے ہیں۔ یہ سن کر ہم دونوں نے اثبات میں سر ہلائے اور اب زاہدہ پوچھ بیٹھی کہ اصل میں ہمارا موضوع خاندانی نظام ہے تو اس کالونی کی زندگی اور رہن سہن کے بارے میں تھوڑا بہت بتائیں اور مشترکہ خاندانی نظام جو کہ ہماری تہذیب کا ایک حصہ ہے اور دل کے سکون کا وسیلہ بھی، پر اپنے تجربات سے نوازیں۔ یہ سن کر انجینئر صاحب چند لمحات تک خاموش رہے پھر بول پڑے:

''آپ لوگ جدید دور کے بچے ہیں۔ اب تو ایسی کالونیوں میں قدیم دور کا مشترکہ خاندانی نظام خواب سا بن گیا ہے۔ پہلے ایک ایک گھر میں کئی لوگ محبت سے ایک ساتھ رہتے تھے لیکن اب تو دو بھائی بھی ایک ہی چھت کے نیچے اکٹھا رہنا پسند نہیں کرتے ہیں تو چاچا بھتیجوں کی بات ہی کہاں۔ دراصل یہ شاید نئے زمانے کی ضرورت بھی ہے اور ہم جیسے پرانی سوچ رکھنے والے لوگوں کی مجبوری بھی، کیونکہ نئے دور کے ساتھ خود کو ایڈجسٹ کرنا پڑتا ہے۔''

''اچھا انکل۔'' زاہدہ نے یہ سن کر ایک اور سوال پوچھا۔ ''آپ کے بچے کیا کر رہے ہیں، کیا وہ ایک ہی فیملی میں رہتے ہیں یا الگ الگ گھر بسائے ہیں۔''

''جی بیٹی'' انجینئر صاحب سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''دراصل میرے دو بیٹے یورپ میں رہتے ہیں۔ دونوں کا اپنا اپنا بزنس ہے۔ ویسے پوش کالونی کے بیشتر بچے

فائرن کنٹریز میں ہی رہتے ہیں۔ اب ایسی کالونیوں میں رہنا کوئی بچوں کا کھیل تھوڑا ہی ہے، یہاں کا لائف اسٹائل کافی دولت وشہرت کا تقاضا کرتا ہے جو کہ ہمارے یہاں ممکن نہیں ہے۔ ویسے پروفیسر صاحب کے بچے بھی تو بیرون ملک میں ہی ہیں، کیا انہوں نے نہیں بتایا۔"

انجینئر صاحب کی فخر احساس باتیں سن کر میں نے سوال پوچھا کہ کیا وہ لوگ یہاں پر آتے رہتے ہیں۔ اور اپنے والدین کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ اب انجینئر صاحب کے بدلے ایک اور بزرگ بول پڑے:

"بیٹا ہمارے بچوں کو اتنی فرصت کہاں ہے کہ وہ یہاں پر بار بار آسکیں۔ بس زیادہ تر فون پر ہی رابطہ رہتا ہے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ انہوں نے ہمارا دل بہلانے کے لئے فارن سے وہ کتے بھیجے ہیں۔ بڑے قیمتی کتے ہیں، وفادار اتنے کہ ہمیشہ بچوں کی طرح ہمارا خیال رکھتے ہیں۔ ہمارے والدین ہماری انگلی پکڑ کر مارننگ واک کرتے تھے اور ہم لوگ ان کتوں کی زنجیر پکڑ کر گھومتے پھرتے ہیں۔ آپ ان محل نما مکانوں میں جائیں تو بچوں کی بجائے ان کتوں سے ضرور واسطہ پڑے گا۔ آہ، پتہ نہیں دولت کی ہوس نے انسان کو کیا سے کیا بنا دیا ہے۔"

بزرگ کی آبدیدہ نگاہیں اور مایوس لہجہ ان کے دل کی اداسی کا واضح اشارہ کر رہا تھا۔ ان لوگوں سے ملاقات کے بعد ہم دونوں رخصت لے کر پارک سے نکل ہی رہے تھے کہ فارن کتوں کے غرانے کا شور ہمیں اپنی طرف متوجہ کر گیا۔ کتے ایک بلی کے پیچھے دوڑتے دوڑتے اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کی بوٹی بوٹی نوچنے لگے۔ بزرگ جس سرسبز وشاداب پیڑ کے سائے میں بیٹھے تھے اس کے اوپر کوّے، بلی کی بے بسی دیکھ کر کائیں کائیں کرنے لگے۔ میں پیڑ کے سائے میں بیٹھے بزرگوں کے اداس چہروں کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ جیسے بہار ہونے کے باوجود سرسبز وشاداب پیڑ کے پتوں پر خزاں کا اثر دکھائی دے رہا ہے۔

وہاں سے نکلنے کے بعد ہم دونوں پروفیسر صاحب' ان کی بیوی اور بزرگوں کی باتوں پر گفتگو کرنے لگے۔ زاہدہ نے فخریہ انداز سے کہا کہ آپ تو پارک میں جانے سے انکار کررہے تھےلیکن وہاں پرتو خاص قسم کا مواد مل گیا۔ میں نے سر اثبات میں ہلا کر چند تعریفی کلمات کہےاور دونوں ہنس پڑے۔ اس کے بعد کئی بار ہم پروفیسر صاحب کے ہاں گئے اور ان کے کتب خانے کے ساتھ ساتھ گفتگو سے بھی استفادہ کرتے رہے۔ جس کی وجہ سے ہمارا پروجیکٹ ٹھوس مباحث کی جانب بڑھنے لگا۔ ایک دفعہ جب ہم نے ملاقات کو فون کیا تو وہاں سے پروفیسر صاحب کی بجائے نذیر نے کال رسیو کی اور بتایا کہ چند روز قبل مالکن کا انتقال ہوگیا اور مالک کافی صدمے میں ہیں۔ ہم لوگ یہ افسوس ناک خبر سن کر غم زدہ ہوگئے اور ایک ہفتے کے بعد جب تعزیت پرسی کے لئے وہاں گئے تو نذیر کو گھر میں اکیلے پایا۔ معلوم کرنے پر اس نے بتایا کہ مالک آتے ہی ہوں گے وہ ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد نذیر نے جب پانی کے دو گلاس ٹیبل پر رکھے تو میں نے پوچھا کہ ماں کی وفات پر ان کے بچے گھر آئے تھے کہ نہیں۔ یہ سن کر نذیر نے سرد آہ بھری اور کہا' نہیں' مالک نے انہیں فون پر بتایا تھا لیکن انہوں نے کہا کہ ہم تین چار مہینے تک نہیں آسکتے ہیں کیونکہ یہاں پر کام بہت پڑا ہے اور بچوں کے امتحانات بھی شروع ہورہے ہیں۔ یہ سن کر ہمیں اور زیادہ افسوس ہوا۔ نذیر نے چائے کے لئے پوچھا لیکن ہم نے انکار کیا اور تھوڑا بہت ان کے بچوں کے بارے میں جاننا چاہا۔ اس نے کہا کہ مالک اور مالکن نے اپنے بچوں کی بہتری کے لئے کیا کچھ نہیں کیا اور وہ آج ماں کی خبر سن کر بھی نہیں آئے۔ میں نے اپنے باپ سے سنا ہے کہ مالک کسی یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے اور اسی یونیورسٹی میں اپنے لڑکے کو بھی پڑھانے پر لگا دیا۔ پھر ایک دن یہ امریکہ چلے گئے اور جب واپس آئے تو اپنے لڑکے کو وہاں پر پڑھانے کے لئے بھیج دیا۔ پہلے وہ سال میں دو تین بار گھر آیا کرتا تھا لیکن اب صرف فون پر ہی بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ مالک کی بیٹی ڈاکٹر ہے اور وہ بھی باہر کسی ملک میں

اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہیں۔نذیر نے اپنی بات ختم کردی اور گیٹ پر گھنٹی کی آواز بج اٹھی۔نذیر یہ کہتے ہوئے دوڑ پڑا کہ شاید مالک آگئے۔پروفیسر صاحب آتے ہی باتھ روم میں چلے گئے اور وہاں سے فراغت کے بعد ہمارے پاس آئے۔ہم دونوں سلام کرتے ہوئے کھڑے ہوگئے اور انہوں نے سلام کا جواب دینے کے ساتھ ہی ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔اب ہم نے ماں جی کی وفات پر اظہار افسوس کیا اور بتایا کہ چند دن قبل نذیر نے فون پر بتایا تھا۔وہ تھوڑی دیر دیوار پر ٹنگی تصویر کو دیکھتے رہے اور پھر اپنی بیوی کے کئی واقعات سنائے۔اس کے بعد آہ بھرتے ہوئے بولے کہ آخر سبھوں کو تو ایک نہ ایک دن جانا ہے اس لئے صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ہم نے جب بچوں کے بارے میں پوچھا تو یہ سنتے ہی پروفیسر صاحب کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا' آبدیدہ ہوکر بول پڑے:

''بچوں کی خوشی کی خاطر ہم لوگوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔میرا بیٹا جب یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر بن گیا تو اس کے لئے میں نے اپنے ضمیر کو مار کر سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کردیا تھا۔لڑکی کے بارے میں باقی کیا کہوں گا۔اس کی خوشیوں کی خاطر ہم نے لاکھوں روپے خرچ کرڈالے تب جاکے وہ ڈاکٹر بن گئی لیکن آج وہ لوگ دولت وشہرت اور اپنے بچوں کا مستقبل سنوارنے کی دھن میں اپنے ہی والدین کو بھول بیٹھے ہیں۔''

ہم لوگ بار بار پروفیسر صاحب کے چہرے کو دیکھتے رہے۔وہاں پر ہمیں مایوسی کا جنگل نظر آیا۔پانی پینے کے ساتھ ایک گولی کھانے کے بعد وہ مزید کہنے لگے کہ:

''اس پوش کالونی کے بظاہر خوش نظر آنے والے بیشتر لوگ اندر سے کتنے بیمار ہیں وہ ان کا درد بانٹ کر ہی پتہ چلتا ہے۔یہ سب آسیبِ زر کا نتیجہ ہے۔ہم لوگ مادیت پرستی کی دوڑ میں تہذیبی اور اخلاقی قدروں کو بھول گئے ہیں۔انسان جب مادیت کا پجاری بن جاتا ہے تو پھر اس کی حیثیت ایک مشین سے کم نہیں رہتی ہے۔اس کے اندر نہ احساس باقی رہتا ہے اور نہ ہی سکون کی خوشبو دوڑتی ہے۔یہ اسی مادی تہذیب کا اثر ہے کہ اب آہستہ آہستہ مشترکہ خاندان کے کلچر کا خاتمہ ہورہا ہے اور سوسائٹی میں مسابقتی دوڑ

شروع ہو چکی ہے جس کی وجہ سے اپنائیت کی بجائے رشتوں کے کھو کھلے پن کا چلن عام ہو رہا ہے۔''

پروفیسر صاحب کے لہجے کا اتار چڑھاؤ اور سسکتی آواز کا کرب محسوس کرتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ جیسے ہم لوگ ایک فاتح کھلاڑی کے لہجے میں ایک ناکام کھلاڑی کی داستان الم سن رہے ہیں۔ ہم لوگ کافی دیر تک وہاں پر ٹھہرے رہے اور جب انہوں نے ہمارے کام کے بارے میں پوچھا تو یہ سن کر خوش ہوئے کہ تقریباً اسی فیصد مکمل ہو چکا ہے۔ وہاں سے نکل کر ہم دونوں پر مایوسی چھا گئی اور پروفیسر صاحب کی ذہنی کیفیت پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے کہ اتنی دولت اور شہرت کے باوجود وہ اندر سے بکھر گئے ہیں۔ اس کے بعد ہم کبھی کبھار ان سے فون پر ہی بات کرتے رہے۔ قریباً پانچ مہینے کے بعد جب میں نے ایک دن فون لگایا تو فون سوئچ آف آ رہا تھا۔

میں نے جب یہ زاہدہ کو بتایا تو ہم نے سوچا کہ شاید ان کے بچے آئے ہوں گے اور انہیں اپنے ساتھ لے کر چلے گئے ہوں گے۔ کئی دنوں بعد میں نے دوبارہ فون لگایا تو نذیر کی آواز سنائی دی۔ نذیر بات کرتے ہی رو پڑا کہ مالک کا انتقال ہو گیا۔ میں نے یہ بات جب زاہدہ کو بتائی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دوسرے دن ہم لوگ وہاں گئے۔ نذیر گھر میں اکیلا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ میں نے جب پروفیسر صاحب کی اچانک موت کے بارے میں پوچھا تو وہ کہہ اٹھا کہ مجھے پچھلے مہینے کے آخری ہفتے گھر سے فون آیا کہ باپ کی طبیعت خراب ہے اس لئے جلدی گھر آنے کے لئے کہا گیا۔ میں نے جب یہ بات مالک کو بتائی تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ بھی ساتھ چلیں گے۔ انہوں نے گاڑی نکالی اور چار بجے کے قریب ہم لوگ گھر پہنچ گئے۔ وہاں پر ماتم کا ماحول چھایا ہوا تھا۔ وہ لوگ میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ میرے پہنچنے کے بعد کفن دفن کا کام شروع ہوا۔ رات کو جب بہت سارے بستی والے اور رشتہ دار گھر پر ہی ٹھہر گئے اور ہر کوئی دلاسہ دیتا رہا تو میں نے محسوس کیا کہ مالک

کسی اور ہی عالم میں پہنچ گئے ہیں۔ اس غم زدہ ماحول میں بھی وہ خوش نظر آ رہے ہیں۔ میں جب انہیں ایک ہمسائے کے یہاں رات کو سونے کے لئے چھوڑ گیا تو وہ کہنے لگے اگر چہ اس وقت یہ بات کہنے کی نہیں ہے لیکن میں خوش ہوں کہ گاؤں میں انسان لاوارث نہیں مرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر کسی کی اپنی اولاد بھی نہ ہو تو وہ ایسے سماج میں بے بسی سے نہیں مرے گا۔ دوسرے دن مالک شہر کے لئے نکل پڑے اور مجھے بتایا کہ انہیں کسی نہ کسی طرح سے فون کرتا رہوں۔ چند دنوں تک میں تعزیت پرسی میں ہی مصروف رہا اور ایک دن اپنے ایک ہمسایہ کو نمبر دے کر مالک سے بات کرنے کو کہا۔ فون پر مالک نے خیر و عافیت پوچھی اور آنے کے بارے میں بھی کہا۔ میں نے کہا آٹھ دس دنوں کے بعد ضرور آؤں گا۔ اس کے چند دن بعد گاؤں میں برف باری شروع ہوگئی۔ راستے بھی بند ہوگئے پھر جب گاڑیاں چلنے لگیں تو میں نے مالک سے فون پر رابطہ کرنا چاہا تاکہ انہیں اپنے آنے کی خبر دوں لیکن فون بند آ رہا تھا، میں تھوڑا سا پریشان ہوا اور اگلی صبح شہر کی طرف نکل پڑا۔ یہاں پہنچ کر میں نے جب گیٹ کھولا تو کتے کی بھونکنے کی آواز آئی۔ میں اسے پچکارتے ہوئے آگے بڑھ گیا تو وہ مجھے دیکھتے ہی دم ہلاتے ہوئے دروازے سے ہٹ گیا۔ میں نے کتے کے منہ پر خون دیکھا۔ میں پریشان ہو کر جلدی اندر چلا گیا۔ مالک اپنے کمرے میں اوندھے منہ فرش پر پڑے تھے۔ میں نے جب انہیں آواز دے کر ہلایا۔ اس کے بعد نذیر کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار نکل پڑی۔ یہ سن کر ہم لوگ بھی اپنے آنسو نہیں روک پائے اور وہاں سے اٹھ کر گیٹ سے نکل آئے۔ باہر نکلتے ہی میں پروفیسر صاحب کے حویلی نما مکان کو دیکھنے لگا اور اس کے بعد کالونی کی طرف نظر دوڑائی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ پوش کالونی کے محل نما مکانات خاموش رہ کر جیسے اپنے اندر کے ویران کھنڈرات کا ماتم منا رہے ہیں۔

○○○

ڈیوڈ سیارہ

(سائنس فکشن)

ویب سائٹ کا مخصوص ٹون بجنے لگا۔

اسکرین پر سینئر سائنسداں.. ڈیوڈ.. ڈیوڈ کالونی کا دھیان اپنی طرف کھینچنے کا سگنل دے رہا تھا۔ اس سگنل سے ویب سائٹ کا مخصوص ٹون بجتا تھا جو کہ ان لوگوں کا سائبر کوڈ تھا۔

ڈیوڈ سائبر ایج کا وہ مشہور سائنسداں تھا جس کا مشن ایک ایسے نئے سیارے کی تلاش تھی جس پر نصف صدی کے دوران انسان نما روبوٹس کی کالونی آباد کرنا تھا تاکہ انسانوں کی عمر میں اضافہ ہو سکے اور ایک نئی دنیا بھی وجود میں آجائے۔

اس مشن پر اُس نے قریباً تیس سال لگا دیے تھے۔ اُس نے جب یہ مشن بصورت ڈاکومینٹری سائنسدانوں کے سامنے ڈِس پلے کیا تھا تو اس کی کامیابی اور ناکامی کے ممکنہ خدشات پر ایک عرصے تک بحث چھڑی تھی اور بالآخر اس کی تھیوری، تحقیق اور عزم کو دیکھ کر بیشتر سائنسداں مشن کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ ورلڈ سائنٹفک ریسرچ ایسوسیشن کی جانب سے جب یہ پرپوزل سائبر منسٹری کو بھیجا گیا تو کچھ عرصہ بعد وہاں سے یہ لکھ کر منظوری مل گئی:

''اس نئے سیارے کا نام ڈیوڈ سیارہ ہوگا۔ اس مشن کو چلانے کے لئے سائبر منسٹری ہر قسم کی مدد کرنے کے لئے تیار ہے کیونکہ یہ سائبر ورلڈ کو ہمارے ملک کی طرف سے ایک اہم تحفہ ہوگا۔''

2080ء میں دنیا کے سامنے ڈیوڈ سیارے کا نام پہلی مرتبہ آیا۔ نہیں تو لوگ

موجود سیاروں کے ناموں سے پہلے ہی واقف تھے۔ ڈیوڈ اُس وقت بیس برس کا ایک نوجوان سائنسداں تھا لیکن نوجوان ہونے کے باوجود اس کی ذہانت اور تحقیقی و تجرباتی کارناموں سے سبھی سائنسداں واقف تھے اور کم عمر میں ہی اس کو سائبر منسٹری سے وژنری سائنسداں کا خطاب بھی ملا تھا۔

اس کی تجویز پر آبادی سے دور ایک سمندری جزیرے پر ریسرچ اکاڈیمی کھولی گئی اور اعلان کروایا گیا کہ جو والدین اپنی مرضی سے اپنے بچوں کو نئے سیارے کی کالونی کے شہری بنانا چاہتے ہیں وہ بچہ پیدا ہوتے ہی سائبر لیبارٹری کے سپرد کریں۔

رفتہ رفتہ بیشتر لوگ بچوں کو پیدا ہوتے ہی سائبر لیبارٹری کے سپرد کرتے چلے گئے جہاں سے ان کو سمندری جزیرے میں قائم ریسرچ اکاڈیمی میں لے لیا جاتا تھا اور پھر وہاں سے ان کے دل، دماغ، آنکھیں اور کچھ دوسرے اجزاء روبوٹس میں لگا دیئے جاتے تھے۔ ان کی پروگرامنگ میں دنیاوی زبان کا خاص خیال رکھا جاتا تھا تاکہ یہ محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ سمجھنے کی صلاحیت سے بھی آشنا رہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے چند دہائیوں میں انسان نما روبوٹس کا ایک کارواں تیار ہوگیا۔ اس وقت تک ڈیوڈ سیارے پر بھی جدید سہولیات کی ایک سائبر کالونی بن چکی تھی اور زمین سے ڈیوڈ کالونی کی طرف راکٹس کے ذریعے انسان نما روبوٹس کو بھیجنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کئی برسوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور بالآخر ڈیوڈ سائنسداں ایک روبوٹ کی طرح سائبر کالونی میں مستقل طور پر قیام کے لئے چلا گیا۔

ڈیوڈ سیارہ کی اپنی ہی ایک الگ دنیا تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ زمینی دنیا سے الگ ایک نئی مشینی دنیا وجود میں آچکی ہو۔ وہاں کا ہر کام مشینی طور طریقوں سے چلتا تھا۔ اٹھنا بیٹھا، سانس لینا، سوچنا سمجھنا، کام کرنا سب کچھ آٹومیٹک ہوتا تھا۔ جیسے انسان نے واقعی مشین کا روپ دھار لیا ہو۔ چونکہ دل اور دماغ بھی روبوٹس میں فکس تھے اس لئے سوچنے سمجھنے کا بھی اپنا ایک طریقہ تھا۔ کئی برسوں کے بعد سائبر منسٹری سے اعلان ہوا کہ ہمارا ملک

ڈیوڈ سیارے پر ٹیکنو جنریشن کو بسانے اور ایک مین میڈ ورلڈ بنانے میں کامیاب ہوا ہے۔اب انسانوں کو موت سے ڈرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ہم نے موت کو شکست دینے کا ارادہ کیا ہے۔ساری دنیا اس قسم کے انکشاف سے حیرت زدہ ہوگئی۔

سوشل میڈیا اور پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا لگاتار ڈیوڈ سیارے کی رپورٹنگ اور وہاں کی دنیا کو بار بار دکھاتے رہے۔زمینی دنیا کے بیشتر انسان اب ڈیوڈ سیارے کے باشندے بننے کی تمنا کرنے لگے۔

کئی برس گزر گئے۔ڈیوڈ سیارے میں ٹیکنو زندگی کی چہل پہل چار سو پھیلی ہوئی تھی۔زمینی زندگی کے برعکس سائبر لائف کی اسپیس بڑھ چکی تھی۔دنیا میں جو انسان ڈیوڈ سیارے پر بسنے والوں کے ساتھ پیدا ہوئے تھے وہ کب کے مر چکے تھے لیکن ڈیوڈ سیارے کے لوگ اپنی طویل عمری پر فخر کرتے تھے۔ایک دفعہ جشن ڈیوڈ سیارہ کا پروگرام بنایا گیا اور سبھی لوگ پروگرام کے دن جشن منانے کے لئے تیار بیٹھے تھے تو ویب سائٹ کا مخصوص ٹون بجنے لگا۔سبھی ویب کیم آن ہو گئے۔

اسکرین پر سینئر سائنسداں 'ڈیوڈ' .. ڈیوڈ کالونی کا دھیان اپنی طرف کھینچنے کا سگنل دے رہا تھا۔اس سگنل سے ویب سائٹ کا مخصوص ٹون بجتا تھا جو کہ ان لوگوں کا سائبر کوڈ تھا اور سبھی لوگوں نے الرٹ ہو کر ویب کیم آن کر دیئے۔ڈیوڈ نے اسکرین پر نظر دوڑائی تو اسے اسکرین کے سامنے انسان نما روبوٹس کی ایک فوج نظر آئی ،وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔سیارے کے سبھی باشندے بھی جشن میں جھوم رہے تھے۔

اسی دوران ڈیوڈ کی آواز گونج اٹھی:

''یہ جشن منانے کا اصلی مقصد یہ ہے کہ ہم لوگوں نے ٹیکنو ورلڈ بنا کر موت کو شکست دے دی۔اب صرف زندگی ہی زندگی ہوگی۔صدیوں سے جو کام کوئی بھی انسان نہیں کر سکا وہ ہم لوگوں نے کر کے دکھایا۔''

یہ کہہ کر تھوڑے وقفے کے بعد جب اس کی قابلیت کی تعریفیں ہونے لگیں تو اس کا

سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے بولنے کا انداز بدل گیا:

''ہم نے عملی طور پر کائنات کو چلانے کی کسی غیر مرئی طاقت کا تصور ختم کر دیا۔''

چار سو خوشی کے سائرن بجنے لگے۔

ڈیوڈ کالونی ابھی اپنی کامیابی کے جشن میں ہی مست تھی کہ اچانک سیارے کا سارا ٹیکنو سسٹم رُک سا گیا اور کاسمک شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں۔

شعاعیں آنکھوں سے اتر کر جگر کو کاٹنے لگیں۔ روبوٹس پگھلنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈیوڈ سیارہ بلیک ہول کی طرف بڑھنے لگا۔

○○○

ایکٹولائف ــــــ (Ectolife)

(سائنس فکشن)

ڈکسن پریشانی کے گرداب میں پھنس چکا تھا۔ اس کی نظر جب بیوی کے مایوس چہرے پر پڑتی تو اسے اپنی زندگی تاریک ہوتی دکھائی دیتی۔

ڈکسن بنیادی طور پر ڈنمارک کا باشندہ تھا۔ ڈنمارک قدرتی چراگاہوں اور اینمل فارمز کے لئے مشہور ہے۔ اس کے خاندان کا بھی ایک بڑا اینمل فارم تھا۔ ڈکسن نے ایم۔ بی۔ اے کرنے کے بعد پولٹری فارم کھولنے کا من بنالیا' تاہم وہ روایتی انداز کے پولٹری فارم چلانے کے برعکس سائنسی انداز کا جدید قسم کا پولٹری فارم کھولنا چاہتا تھا۔ ایک دن جب اس نے اس تعلق سے اپنے ایک دوست سے پوچھا تو اس نے پولٹری فارم کا سرٹیفکیٹ کورس کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ مشورہ اسے پسند آیا۔ گھر والوں سے بات کر کے اس نے شہر کے ہی ایک ادارے میں داخلہ لیا اور ایک برس کا کورس بھی مکمل کرلیا۔ چند مہینے فارم کھولنے کے بنیادی لوازمات پر غور کرتا رہا اور شہر کے کئی بڑے بڑے پولٹری فارمز کو بھی دیکھتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ جب کام شروع کرے تو اس کا فارم ہر قسم کی جدید سہولیات سے آراستہ ہو۔

ایک دن وہ گوگل پر کچھ تلاش کر رہا تھا تو وہاں پر ایک ٹریول ایجنسی کا اشتہار سامنے آیا جس میں انڈیا کی سیر و تفریح کے لئے جانے کی تفصیل تھی۔ پتہ نہیں اشتہار دیکھ کر اس کے دل میں کیوں انڈیا گھومنے کا خیال آیا۔ اس نے ہیلپ لائن پر ڈائل کیا اور تقریباً آدھے گھنٹے تک جانکاری لیتا رہا اور پھر چند ہفتوں کے اندر اندر سبھی تیاریاں مکمل کرنے کے بعد وہ تین مہینے کی سیر و تفریح کے لئے انڈیا پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر وہ کئی مشہور

شہروں، کئی یونیورسٹیوں اور تاریخی وسیاحتی مقامات کی سیر سے بہت محظوظ ہوا۔

ایک دفعہ وہ کسی انگریزی میگزین کا مطالعہ کر رہا تھا تو یہ پڑھ کر حیران ہوا کہ کیرلا کو دنیا کے اہم سیاحتی مقامات میں شمار کیا جاتا ہے۔ بس پھر کیا تھا ایک دو دن کے بعد دہلی سے کیرلا چلا گیا۔ چونکہ کیرلا کی کچھ جگہوں پر زیادہ ہی انگریزی کلچر کا اثر ہے اس لئے اسے کچھ زیادہ ہی لطف آیا۔ ایک دن وہ ایگریکلچر یونیورسٹی پہنچا۔ یونیورسٹی گھومنے کے بعد وہ پولٹری فارم سیکشن چلا گیا۔ وہاں پر اس نے سیکشن کے ہیڈ سے ملنے کے لیے ایک لڑکی سے پوچھا۔ لڑکی انگریزی حلیہ دیکھ کر خوش ہوئی اور اس کو سیکشن ہیڈ کے چیمبر میں لے کر واپس نکل گئی۔ سیکشن ہیڈ بھی اسے دیکھ کر خوش ہوا اور ہاتھ ملا کر بیٹھنے کو کہا۔ متعارف ہونے کے بعد تھوڑی دیر تک دونوں ملکوں کے بارے میں گفتگو ہوئی اور اس نے انڈیا کی سیر سے محظوظ ہونے کا بھی بتایا، اپنی ڈگری اور پولٹری فارم سے دلچسپی کا اظہار بھی کیا اور وہاں کے پولٹری فارم دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو سیکشن ہیڈ جو کہ خود بھی اسی سبجیکٹ کا ماہر تھا، نے خوش ہو کر اسے یونیورسٹی کے پولٹری فارمز دیکھنے کی اجازت دے دی بلکہ خود بھی ساتھ چلا گیا۔ ایک دو گھنٹے کے بعد دونوں چیمبر میں لوٹ آئے۔ اس کے بعد چائے کا دور چلا اور ڈکسن نے جب اپنے پولٹری فارم کے کورس کا بتایا تو ہیڈ صاحب بہت خوش ہوئے اور اسے طلبہ کو توسیعی خطبہ دینے کی گزارش بھی کی اور ساتھ ہی یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں چند دنوں کے لئے بطور مہمان ٹھہرنے کا مشورہ دیا۔ ڈکسن یہ غیر متوقع بات سن کر خوش ہوا۔ دو تین دن تک وہ طلبہ کو لیکچر دیتا رہا اور طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ بھی متاثر ہوتے گئے۔ جس لڑکی نے اسے ہیڈ کے چیمبر میں چھوڑا تھا وہ بھی اسی شعبے میں زیر تعلیم تھی اور ان دنوں لیکچر کے بعد وہ اس سے ملتی بھی رہی اور سبجیکٹ کے بارے میں سوالات پوچھتی رہی۔ ڈکسن کو بھی یہ بات پسند آتی گئی اور آخری دن وہ یہ جان کر اور بھی خوش ہوا کہ یہ لڑکی بھی کرسچن ہے اور کشمیر کی رہنے والی ہے۔ ان کا گھر سرینگر میں ہے اور نام لوسی ہے۔ آخری ملاقات کے وقت سیکشن ہیڈ نے بتایا کہ وہ

وی۔سی صاحب سے بات کریں گے اور آپ کو چند مہینوں کے لئے کنٹریکٹ لیول پر لیکچر دینے کے لئے بلائیں گے۔ اگر منظوری ملی تو وہ یونیورسٹی سے آفیشل لیٹر بھی سینڈ کروائے گا تاکہ آپ کو یہاں آنے میں آسانی ہو۔ ڈکسن نے رضامندی ظاہر کی اور اپنا مکمل پتہ اور دیگر ضروری معلومات کاغذ پر لکھ کر شکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

چند مہینوں بعد ڈکسن کو یونیورسٹی سے اجازت نامہ مل گیا اور وہ گھر والوں سے مشورہ کر کے کیرلا واپس لوٹا۔ یہ کنٹریکٹ ایک سال کا تھا اور یونیورسٹی کی طرف سے گیسٹ ہاوس میں طعام و قیام کا انتظام بھی تھا۔ اس کے ذمہ ایک تو طلبہ کو لیکچر دینا تھا اور ساتھ ہی پولٹری فارم کو جدید سہولیات کے تحت چلانے کا پروجیکٹ بھی تھا۔ وہ دونوں کام بحسن خوبی انجام دیتا رہا۔ چونکہ طالب علموں میں چند ہی کریسچن تھے۔ باقی زیادہ تر ہندو اور مسلمان تھے۔ لیکن اس کے لیکچر سبھی کو پسند آتے تھے اور ہر کوئی اس سے ملتا جلتا رہتا۔ لوسی بھی چونکہ اسی شعبے کی طالبہ تھی اور پہلے دن تو اسی سے ملاقات ہوئی تھی اس لئے وہ بلاتکلف اس کے ساتھ بات چیت کرتی رہتی۔ لوسی وہاں انکل کے گھر رہتی تھی۔ اس کا انکل ایک یونیورسٹی میں انگریزی کا پروفیسر تھا۔ اس لئے دو تین مہینوں بعد ڈکسن کا آنا جانا لوسی کے انکل کے گھر شروع ہو گیا۔ لوسی کے انکل نے ڈکسن کی قابلیت اور اخلاق دیکھ کر ایک دو بار کہا بھی کہ وہ گیسٹ ہاوس کے بجائے ان کے گھر میں رہا کرے لیکن ڈکسن ہمیشہ شکریہ کہتے ہوئے معذرت کرتا رہا۔

لوسی اردو بھی جانتی تھی اور ایک دو انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر چکی تھی۔ ایک دن ایک اردو کتاب اس کے ہاتھ میں دیکھ کر ڈکسن نے پوچھا کہ یہ کونسی کتاب ہے؟ تو اس نے بتایا یہ اردو کی کتاب ہے۔ آپ نہیں پڑھ سکتے۔ یہ سن کر ڈکسن مسکرایا اور تھوڑے وقفے کے بعد کہا کہ آج سے آپ مجھے اردو سکھائیں گی۔ یہ سن کر لوسی مسکرائی اور اس کو مذاق ہی سمجھا۔

لیکن دوسرے دن وہ حیران ہوئی جب اس کے انکل کے گھر آ کر ڈکسن نے کہا

کہ وہ آج سے ہی اردو سیکھے گا۔ اس طرح یہ سلسلہ شروع ہوا اور دو چار مہینوں کے بعد ڈکسن کچھ حد تک اردو سمجھنے بھی لگا تھا، پڑھنا بھی اور تھوڑا بہت لکھنا بھی۔

اب یہ دونوں انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی باتیں کرتے رہتے اور لوسی اس کے تلفظ پر خوب ہنستی تھی۔ رفتہ رفتہ دونوں کے دلوں میں محبت جگہ بنا گئی اور ایک دن ڈکسن نے لوسی سے مشورہ کر کے انکل سے رشتے کی بات چھیڑی۔ انکل نے یہ سن کر کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا لیکن لوسی کے والدین کی رضامندی کی شرط رکھی جو کہ کشمیر میں تھے۔ ایک دو مہینوں کے بعد انکل نے پُرمسرت لہجے میں کہا کہ لوسی کے والدین رشتہ کے لئے تیار ہو گئے۔ تاہم لوسی ان کی اکلوتی اولاد ہے اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ آپ کو کشمیر میں ہی رہنا ہوگا اور مجھے آپ کے گھر جا کر آپ کے والدین سے ملنا ہوگا' اسی بہانے ڈنمارک کی سیر بھی ہوگی۔ ڈکسن یہ سن کر تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہا اور پھر بولا کہ وہ کچھ دنوں کے بعد بتائے گا۔

دو چار دن ڈکسن اس بارے میں سوچتا رہا اور پھر کئی دنوں تک فون پر گھر والوں سے مشورہ کرتا رہا۔ چونکہ اس کے اور بھی دو تین بہن بھائی تھے اس لئے گھر والوں نے اجازت دے دی اور پھر اس نے پہلے لوسی کو یہ خوشخبری سنائی اور اس کے بعد اس کے انکل کو۔

ایک دن ڈکسن انکل کے گھر میں تھا تو اس نے لوسی کو وہ اردو کتاب لانے کے لئے کہا۔ انکل بھی گھر میں موجود تھے۔ لوسی نے کتاب لا کر اس کے ہاتھوں میں تھما دی۔ کتاب کا نام تھا 'خدا اور کائنات'۔ نام دیکھ کر ڈکسن مسکرایا اور کہا:

''کیا یہ گاڈ (خدا) سے متعلق ہے؟''

''ہاں۔ یہ خدا اور کائنات یعنی یونیورس سے متعلق ہے۔'' لوسی نے خوش ہو کر کہا۔ ''جو ساری کائنات کا مالک ہے۔''

''اچھا...'' ڈکسن دوبارہ مسکرایا اور پوچھا۔ ''تو آپ بھی خدا پر یقین رکھتی ہیں۔''

''ہاں کیوں نہیں۔'' لوسی مسکراتے ہوئے بولی۔

''لیکن میں نے کبھی اس بات کو سیریس نہیں لیا۔'' ڈکسن کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولا۔

چونکہ انکل بھی وہاں پر موجود تھے تو وہ یہ سن کر تھوڑے حیران ہوئے۔ لیکن بڑے مہذبانہ انداز سے بولے:

''بیٹا.. آج کل کے کئی لوگ اس بات کو سیریس نہیں لیتے ہیں لیکن کائنات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ خدا موجود ہے۔''

یہ سن کر ڈکسن نے بس اتنا ہی کہا کہ میں نے کبھی اس بات کو سیریس نہیں لیا اور نہ کبھی اس بارے میں سوچنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے باوجود ڈکسن کتاب کا مطالعہ کرتا رہا اور جہاں پر سمجھنے میں مشکل در آتی تو وہ انکل یا لوسی سے پوچھتا رہتا۔

ڈکسن کا کنٹریکٹ ختم ہونے کے بعد انکل اور لوسی دونوں اس کے ساتھ ڈنمارک چلے گئے۔ ڈکسن کے گھر والوں نے ان کا استقبال کیا۔ دس بیس دن تک انہوں نے ڈنمارک کی کئی جگہوں کی سیر کی اور وہاں کی ترقی سے حیران بھی ہوئے۔

واپس لوٹ کر اب سبھی لوگ رشتہ جوڑنے پر آمادہ ہوئے۔

ایک سال میں قانونی دستاویزات کی کاروائی مکمل ہوگئی اور تب تک لوسی نے بھی ڈگری حاصل کر لی۔ ڈکسن گھر کے کئی افراد کے ساتھ ڈنمارک سے کیرلا چلا آیا اور پھر دونوں کی شادی کیرلا میں ہی انکل کے گھر انجام دی گئی۔ چند مہینوں کے بعد دونوں کشمیر چلے آئے۔ ایک دو سال تک ڈکسن پولٹری فارم کھولنے کی تیاری کرتا رہا۔ لوسی کو بھی ایک نجی کمپنی میں جاب مل گئی۔ لوسی کے والدین اچھے سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ اس لئے پولٹری فارم کھولنے میں مالی مشکلات نہیں آئیں۔ چونکہ لوسی کی خاندانی زمین کافی تھی اس لئے زمین کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ پولٹری فارم جدید سہولیات سے مزین تھا۔ یہ لوسی کے نام پر ہی کھولا گیا تھا۔ کام بھی اچھا چل پڑا۔ ویسے بھی ڈکسن کا دل کشمیر کے خوبصورت مناظر

نے موہ لے لیا تھا۔ اس لئے اس کو اطمینان تھا کہ اس کا فیصلہ ٹھیک ہی رہا۔ اکثر و بیشتر دونوں میاں بیوی شام کے وقت نشاط' شالیمار اور ہارون گارڈن سیر کو جاتے۔ یہ ان کے لئے آسان بھی تھا کہ ان کی رہائش بھی شہر میں ہی تھی۔ کبھی کبھار ڈل کی سیر بھی کرتے تھے۔ لوسی اکثر چرچ جاتی اور ڈکسن کو بھی کہتی رہتی لیکن وہ بس کبھی کبھار اس کا دل رکھنے کے لئے چرچ چلا جاتا۔

زندگی یونہی آگے بڑھتی رہی اور دونوں زندگی کے بہترین ہم سفر ثابت ہوتے گئے۔

ڈکسن کو کبھی کبھار لوسی کے ساتھ ایک مقامی کلینک تک بھی جانا پڑتا تھا۔ یہ شہر کا مشہور کلینک تھا جس کو ڈاکٹر مشتاق چلاتا تھا۔ اب ڈکسن اور ڈاکٹر مشتاق کی دوستی ہوگئی تھی۔ ایک کامیاب بزنس مین ہونے کے باوجود ڈکسن کو اندر ہی اندر ایک پریشانی کھائے جا رہی تھی کیونکہ طبی طور پر لوسی بچہ جننے کی صلاحیت سے قاصر تھی۔

ڈاکٹر مشتاق سے اس مسئلے پر کئی بار صلاح مشورہ ہوتا رہا۔ وہ بار بار کہتا کہ ہم تو علاج کرتے ہیں، باقی خدا سے بھی دعا مانگا کریں۔ خدا اور دعا کا نام سنتے ہی ڈکسن بات ٹالتا رہتا۔

کئی بار جب لوسی نے یہ دیکھا تو وہ ڈکسن سے کہتی کہ آپ خدا کے ہونے پر کیوں ہچکچاتے ہیں۔ ڈکسن بس یہی جواب دیتا کہ میری عقل یہ ماننے سے انکار کرتی ہے۔ تم دیکھتیں نہیں کہ عقل کے استعمال سے ہی میں نے اتنا کام بڑھایا ہے اور کامیاب بھی ہوا اور اس کے بعد وہ لوسی کو فریڈرک نطشے کا فلسفہ ''خدا کی موت'' اور دوسرے ملحد فلسفیوں کے نظریات سناتا رہتا۔ اس موضوع پر دونوں کے درمیان اکثر بحث و تکرار ہوتی رہتی۔ ایک دفعہ دوران بحث ڈکسن نے پوچھا کہ تم کہتی ہو کہ کائنات خدا نے بنائی ہے تو اس سے پہلے کیا تھا؟

یہ سن کر لوسی نے غالب کا مصرع سنایا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈکسن یہ مصرع سن کر بولا کہ یہ کس نے کہا ہے؟

''غالبؔ نے...''

یہ غالبؔ کون ہیں؟

''غالبؔ اردو کے مشہور شاعر ہیں۔''

یہ سن کر ڈکسن نے مزید کچھ نہیں کہا۔

کچھ عرصے کے بعد ڈکسن نے ہیچری فارم کھولنے کا پروگرام بنایا۔لوسی سے مشورہ کر کے انکل کو فارم کی پوری جانکاری دے دی۔ پھر وہ لوسی کو ساتھ لے کر کیرلا چلا گیا۔ہیچری فارم بن جانے کے بعد کام بھی ٹھیک طرح سے چلتا رہا۔

ایک دن وہ ہیچری فارم میں چوزے تخلیق ہونے کے مصنوعی طریقہ کار پر سوچ رہا تھا کہ اس کے ذہن کو ایک خیال سے جھٹکا سا لگا۔لیکن تھوڑی دیر کے بعد ہی خیال اس پر خوشگوار کیفیت طاری کر گیا۔ایک دفعہ اس نے لوسی کے پروفیسر انکل کو اپنے خیال سے آگاہ کیا۔انکل اس کی بات سن کر تھوڑی دیر تک خاموش رہے پھر ڈھارس بندھاتے ہوئے بولے:

''ڈکسن..تمہاری پریشانی کا ایک حل ہے اگر تم لوگ اس کے لئے تیار ہو۔''

یہ سنتے ہی ڈکسن کے اندر جیسے نئی جان سی آ گئی۔ اس نے خوش ہو کر انکل کی رائے جاننا چاہی:

''انکل..آپ بتائیں، میں اس بات پر ضرور غور کروں گا۔''

''میرا ایک دوست انگلینڈ میں رہتا ہے۔وہ کافی مشہور ڈاکٹر ہے اور ایسے مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ایک دو برس قبل میں جب انگلینڈ گیا تو اس کے ہاں ہی قیام کیا تھا تب اس نے اس بارے میں کئی بار بتایا تھا۔''

انکل کی بات سن کر ڈکسن نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور دونوں نے انگلینڈ

جانے کی تیاری کی۔

ایک سال بعد دونوں میاں بیوی انگلینڈ سے خوش خوش واپس گھر لوٹے۔ اپنے بچے کو دیکھ کر ڈکسن پھولے نہیں سماتا تھا۔ چند برسوں بعد اس نے سوچا کہ جو خوشی انہیں ملی ہے وہ دوسرے لوگوں کو بھی ملنی چاہیے اور مستقبل میں یہ بزنس خوب چل سکتا ہے۔ اس تعلق سے کئی بار انگلینڈ کے ڈاکٹر سے صلح مشورہ ہوتا رہا اور وہاں سے ماہرین کی ایک ٹیم بلوا کر جدید تیکنالوجی سے لیس ایک فارم بنایا گیا۔ جس کا نام ڈکسن نے اپنے لڑکے کے نام پر جیمس ایکٹولائف فارم رکھا۔

یہ فارم بھی رفتہ رفتہ کامیاب ہوتا گیا۔ ڈکسن دونوں فارموں کی نگرانی خود کرتا تھا اگرچہ کئی لوگ ان میں کام کرتے تھے۔ اور وہ اپنی کامیابی پر ہمیشہ فخر کرتا۔

تاہم.. اتنی کامیابی کے باوجود ڈکسن ہمیشہ ایکٹولائف فارم کے بچوں اور ہیچری فارم کے چوزوں کے درمیان امتیاز کرتے وقت ہمیشہ فطری مسکراہٹ کا متلاشی نظر آتا تھا۔ اسے یہ بچے جیسے چلتے پھرتے روبوٹ لگتے تھے اور تخلیق کائنات پر غور کرتے ہوئے اسے اپنا وجود خدا کا شاہکار لگتا تھا۔

○○○

گلوبل جھوٹ

(مزاحمتی افسانہ)

''ذہنِ انسانی' احساس کی سرد و گرم لہروں سے ہی غور و فکر کے ساحلوں سے ٹکراتا رہتا ہے'' وہ سنجیدگی سے میرے سوال کا جواب دے رہا تھا۔ ''اور فکری سطح پر انسان' احساس برتری کی گرمی یا احساس کمتری کی سردی کا اسیر رہتا ہے۔''

''آج پھر تیرے فلسفیانہ افکار کے بار نے میری ناتواں سوچ کو داب کر رکھ دیا۔'' میں نے اُسے مذاقاً چھیڑا۔

''میرا سوال تو آسان تھا۔''

''نہیں! انٹرنیٹ مائنڈ.. تم کسی بڑے مسئلے کو بھی خارجی سطح پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہو۔'' اُس نے دھیمے لہجے میں کہا ''جب قوموں کے اتار چڑھاؤ کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو اس پر دو اور دو کا چار والا ریاضی فارمولہ نہیں چلتا بلکہ اس کے لئے داخلی سطح پر سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔''

ہمارے درمیان جب بھی کسی مسئلہ پر گفت و شنید ہوتی ہے تو میرا فلسفی دوست' ایوان فلسفہ کی بلندی سے اپنے سرد و گرم افکار کی ہوائیں چھوڑتا رہتا ہے اور مجھے اس کے حکیمانہ نکتوں کی تہہ تک پہنچنے کے لئے فکر کی کئی سرحدوں کو پھاندنا پڑتا ہے۔

'فخر کرنے کے اعتبار سے ہم لوگ اگرچہ دوسرے لوگوں سے کئی قدم آگے ہیں۔'' میں نے ایک حساس سوال اُس کے سامنے رکھ دیا'' تو پھر ہم کیوں دنیا کے گوشے گوشے میں احساسِ کمتری کے شکار نظر آرہے ہیں۔''

''ہم لوگ حال کو بھول کر ماضی پر فخر کرتے ہوئے اپنے مستقبل کو بھی فراموش کر

رہے ہیں۔'' وہ میری طرف بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بول پڑا۔ ''موجودہ دور کی دھما کہ خیز علمی دنیا میں اپنے آپ کو ایڈ جسٹ کرنے کے لئے سادگی کے ساتھ ساتھ چالاکی اور بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت کی بھی ضرورت ہے' نہیں تو سادہ ذہن انسان نئے دور کے خیر وشر اور مکر وفریب کی نئی نئی اصطلاحوں کے امتیاز سے قاصر رہے گا۔''

اُس کی یہ فکر انگیز باتیں سنتے سنتے میں نے چائے کی پیالی اُس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا کہ احساسِ کمتری کے اس دلدل سے نکلنے کے لئے کونسی کمند کارگر رہے گی؟

''ہمارے ذہن تقلید پسندی کے اسیر ہو چکے ہیں۔'' وہ چائے کی چسکی لیتے ہوئے گویا ہوا۔ ''ہماری سوچ پر جمود چھایا ہوا ہے ہمیں اجتہادی فکر اور متحرک سوچ سے کام لینا پڑے گا۔'' اُس کی یہ تجسس آمیز باتیں سُن کر میں سوچنے لگا کہ کسی معاملے کو بہتر طور پر سمجھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اُس معاملے کے متعلق اُسی انسان سے صلح مشورہ کرنا چاہیئے جو معاملہ فہم ہونے کے ساتھ ساتھ اُس معاملے کے تمام پہلوؤں کا گہرا شعور رکھتا ہو۔ نہیں تو اناڑی سوچ کا حامل انسان اناڑی مشوروں سے ہی نوازے گا۔

اُس کی دل پذیر باتوں نے میرے ذہن کے دریچے کھول دیئے اور میں خیالات کے سمندر میں غرق ہو گیا کہ ہم ایک درخشاں تہذیب کی پروردہ نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارا تابناک ماضی دوسرے اقوام کے لئے نشانِ راہ ثابت ہوا تھا اور وہ ڈارک ایج سے نکل کر برائٹ ایج میں آن پہنچے' برعکس اس کے ہم برائٹ ایج کے بنیاد گزار ہونے کے باوجود فکری طور پر ڈارک ایج میں بسنے والوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم مفتوح . . ہماری سوچ مفتوح . . اور کمپرومائزڈ سوچ والے انسان بھی فکری مفلسی کا شکار نظر آرہے ہیں۔

اُس نے مجھے خیالات میں غرق پا کر آواز دی ''کہاں کھو گئے؟'' اُس کی آواز سن کر میں چونک گیا اور اُسے کہنے لگا کہ میں سوچ رہا ہوں کہ ''ہم اپنی کمزوریوں کو کب سمجھنے اور انھیں دور کرنے کی کوشش کریں گے؟''

''تم کن کمزوریوں کی بات کر رہے ہو؟'' وہ پوچھ بیٹھا۔

''ہمیں ہر طرح سے دبایا جا رہا ہے۔'' میں بے قراری میں کہہ اٹھا ''ہمیں روز بہ روز کمزور بنایا جا رہا ہے۔''

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر کہنے لگا۔ ''تم جس حقیقت کو کمزوری سمجھ رہے ہو وہ اصل میں ہماری خامیاں ہیں۔''

''ہماری خامیاں'' میں حیران ہو کر بول پڑا۔ ''وہ کیسے؟''

''ہمارے آفاقی دستور میں ہمیں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند متحد رہنے کا اصول بتایا گیا ہے اور ہم ہر جگہ فرقوں، مسلکوں اور انانیت کے تباہ شدہ کھنڈروں میں پھنسے ہوئے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔

''ہم نے آفاقی پیغام کا مغز چھوڑ کر صرف چھلکے بانٹنے میں ہی اپنی سوچ اور طاقت کو لگا دیا ہے اور ہر گروہ عصری تقاضوں سے بے خبر اپنے حصّے کے چھلکے کو اصلی مغز قرار دے رہا ہے۔''

اُس کی حکیمانہ باتوں سے میرے ذہن پر پڑے بے خبری کے دبیز پردے آہستہ آہستہ چاک ہونے لگے۔ ''اس اندھیرے سے نکلنے کی کوئی روشن کرن بھی موجود ہے۔'' میں استفہامیہ انداز سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں'' وہ ہاتھوں کو اوپر اٹھاتے ہوئے پکار اٹھا ''ہمیں اپنے اردگرد چھائے ہوئے جمودی غلاف کو اجتہادی تلوار سے پھاڑ ڈالنا ہوگا اور متحد ہو کر متحرک سوچ کے ساتھ آگے قدم بڑھانا ہوگا۔''

''اس وقت تو عالمی سطح پر چند دماغ اس مقصد کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔'' میں نے سنجیدگی کے انداز میں کہا ''لیکن انھیں دہشت گرد یا دہشت پسند جیسے القاب سے نوازا جا رہا ہے۔''

''جس جدوجہد کی طرف تم اشارہ کر رہے ہو وہ نیند میں چلنے جیسا عمل ہے۔'' وہ کرسی پر بیٹھ کر مجھے سمجھانے لگا۔ ''لیکن اس جدوجہد کے پیچھے بڑے باخبر اور ہوشیار ذہن کام کر

رہے ہیں تاہم اس تحریک سے وابستہ زیادہ تر افراد فکر وتدبر سے عاری صرف جذباتی سوچ کے حامل دکھائی دے رہے ہیں۔اس تحریک کو فکر وتدبر کے ساتھ آگے بڑھانے کی ضرورت ہے اور عصری تقاضوں کے مطابق زندگی کے ہر شعبے میں سبقت لینے کی ضرورت ہے۔''

وہ چند منٹ خاموش رہنے کے بعد میرے سوال کے دوسرے حصّے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہنے لگا۔''اور تم یہ جو'دہشت گردی' کی جدید اصطلاح کی بات کر رہے ہو۔ اصل میں یہ عصرِ حاضر کے طاقت ور حیوانوں کا ایک ایسا گلوبل جھوٹ ہے جسے وہ جمہوریت کے فروغ کے بہانے مصنوعی سچ بنا کر بیدار ذہن انسانوں کی بیداری پر روک لگانے کے لئے استعمال کر رہے ہیں تاکہ وہ اپنے بے لگام پاور کی دہشت گردی سے دنیا کے کمزور اور بے بس انسانوں کو جمہوریت پسند غلام بنا سکیں۔''

○○○

سنگ باز

(مزاحمتی افسانہ)

شُتر بے مہار کی گھنٹی کی ڈراونی آواز نے پھر اُس کے کان کے پردوں کو پھاڑتے ہوئے، اُس کی خوف زدہ نیند پر شب خون مار کر، اُس کے سکون بھرے گھروندے کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ شب دیجور کے بھیانک سائے میں ''ماں! ان ظالموں نے اُسے گولی ماردی... وہ زخمی حالت میں سڑک پر اُن سے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے.. ماں! وہ تڑپ تڑپ کر رو رہا ہے... ماں، وہ بے بسی کی حالت میں جان دے رہا ہے...'' کہتے ہوئے گلستان اپنے بیڈ سے گھبرا کر اٹھا اور ماں کی چھاتی پر سر مار مار کر سسکیاں بھرنے لگا۔

ماں کی نیند اچانک ٹوٹ گئی۔ ''گھبراؤ مت میرے لال، گھبراؤ مت! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' کہتے ہوئے وہ خود بھی رو پڑی اور ''ہمارا خدا ان قاتلوں سے تمہارے معصوم دوست کے قتل کا بدلہ ضرور لے گا۔'' ماں دلاسہ دیتی ہوئی آنسو بہاتے بہاتے اُس کے سر کو اپنے شفقت بھرے ہاتھ سے ستارۂ سحری تک سہلاتی رہی۔

پندرہ برس کا طالب علم گلستان خان جب بھی اس شبِ سُرخاب کی طغیانی میں اپنی غمگین سوچ کو نیند کے تلخ سمندر میں ڈبونا چاہتا تو ان ہی کرب زدہ لمحوں میں ان ستیزۂ چشم بھگت باز درندوں کی آگ برساتی گولیوں کا وہ دہشت ناک خونین منظر خوفناک زلزلہ بن کر اُس کے نازک ذہن کی نازک سوچوں اور اس کے شیشۂ دل کے حسین سپنوں کو چکنا چور کر کے رکھ دیتا تھا، جس میں اُس کے سامنے.. دن کے اُجالے میں.. اُس کے سولہا برس کے معصوم دوست بوستان شاہ کے نرم و نازک گلابی بدن کو سیاہ پوش درندوں کی زہریلی گولیوں نے پرزہ پرزہ کر کے رکھ دیا تھا اور اُس کا معصوم دوست گولیاں کھاتے کھاتے خون آلودہ

ہاتھوں سے اپنے اسکولی بیگ سے کتابیں دکھا دکھا کر ان سنگ دل جلادوں کو اپنی بے گناہی کا نا کام وشواش دلا رہا تھا۔

پچھلی کئی دہائیوں سے جنتِ کشمیر کے نہ جانے کتنے ہی خوشبودار پھول، معصوم بوستان شاہ کی طرح آبدیدہ نگاہوں میں سجائے ہوئے رنگ برنگے خوابوں کی تعبیر دیکھے بغیر ہی اپنی تلخ بھری یادیں وطن کی شبنمی پلکوں پر چبھتے کانٹوں کی طرح چھوڑ کر چلے گئے' اور نہ جانے کتنے ہی گلابی پھولوں کو وہ سیاہ بخت جابر گلچیں' کھلنے سے پہلے ہی مسل کر رکھ دیں گے۔

گلستان اور بوستان ایک ہی اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ ہم جماعت اور ہم مزاج ہونے کی بدولت دونوں میں مثالی دوستی قائم تھی۔ گلستان کا خواب ڈاکٹر بننے کا تھا اور بوستان انجینئر بننے کا سپنہ دیکھتا رہتا۔ ایک روز ''یومِ امن'' منانے کے موقع پر امن گروپ کی طرف سے' اسکول کے احاطے میں ''گڈوِل'' پروگرام کے تحت اسکول کے طالب علموں کے لئے ایک سمینار کا اہتمام کیا گیا' جس کا موضوع تھا، ''میری زندگی کا مقصد''۔ دوسرے طالب علموں کے ساتھ ساتھ گلستان خان اور بوستان شاہ نے بھی تقریب میں حصہ لیا۔ امن گروپ کے علاوہ سمینار میں دوسرے لوگ بھی طلبہ کی تقریریں دلچسپی سے سُن رہے تھے۔ گلستان خان نے موضوع کی مناسبت سے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''میری زندگی کا مقصد ڈاکٹر بننا ہے تا کہ میں اپنی قوم کے ان ہزاروں زخمی افراد کا علاج کرسکوں جو رواں تشدد کی وجہ سے اپاہج بن گئے ہیں۔'' اسی طرح بوستان شاہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''وہ ایک انجینئر بننے کا خواب دیکھ رہا ہے تا کہ وہ ان اپاہج افراد کے تباہ شدہ مکانوں کو دوبارہ تعمیر کرا سکے جنہیں تشدد کی آگ نے راکھ کا ڈھیر بنا ڈالا ہے۔'' دونوں دوستوں کی مثبت تقریروں پر اگر چہ لوگ خوش ہو کر تالیاں بجاتے رہے تاہم امن گروپ کی بدامن آنکھوں میں سُرخی پھیل گئی۔ سمینار کے اختتام پر گلستان اور بوستان کو بہترین کارکردگی دکھانے پر ''امن گروپ'' کی طرف سے ''تلاشِ امن'' نامی کتاب سے نوازا گیا۔

تقریب ختم ہونے کے بعد دونوں دوست پُرمسرت موڈ میں گھر کی جانب نکل

پڑے۔سڑک پار کرتے ہی گلستان نے بوستان سے کہا کہ تم یہاں پر ہی انتظار کرو میں دکان سے چاکلیٹ لاتا ہوں۔ وہ ابھی چاکلیٹ خرید ہی رہا تھا کہ اچانک بغیر نمبر کی ایک سبز رنگ گاڑی بوستان کے نزدیک آکر ٹھہر گئی اور چند نقاب پوش گاڑی سے اتر کر بوستان پر گولیاں چلانے لگے،بوستان گولیاں لگنے سے سڑک پر گر پڑا۔ یہ خونیں منظر دیکھ کر جب لوگوں نے نقاب پوشوں سے گولیاں چلانے کا سبب پوچھا تو انھوں نے اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے پتھر دکھاتے ہوئے کہا ''یہ ہم پر سنگ باری کر رہا تھا.. سنگ باز سالا!'' اُن کا جھوٹ سنتے ہی بوستان نے جان دیتے ہوئے اپنے اسکولی بیگ سے کتابیں نکال نکال کر کہا کہ ''میرے بیگ میں صرف کتابیں ہیں، پتھر نہیں.. میں بے قصور ہوں..!''

لوگ جب بوستان کی لاش اٹھا کر حاکم الوقت کے مصنوعی دربار میں انصاف کی گھنٹی بجانے لگے تو ڈیوڑھی پر تعینات حاکم کے وفادار کارندوں نے انھیں یہ کہہ کر وہاں سے بھگایا کہ ہماری عدالت کی ترازو میں کتابوں کے پلڑے کے اوپر پتھروں بھرا پلڑا بھاری پڑ گیا۔لوگ مایوس ہو کر بوستان شاہ کی لاش لے کر خاموشی کے ساتھ قبرستان کی جانب چل پڑے۔ وہ قبرستان.. جس پر کسی ظالم کا زور نہیں چلتا تھا اور جو کئی دہائیوں سے خاموشی کے ساتھ سینکڑوں مظلوموں کی لاشوں کو اپنی کشادہ گود میں سُلاتا آیا تھا۔

سالانہ امتحان کے ایام چل رہے تھے۔گلستان خان بھی بددلی کے ساتھ امتحان ہال میں بیٹھ گیا۔اُس کے سامنے جب دسویں جماعت کا امتحانی پرچہ ڈالا گیا تو کمرے میں ہر طرف اُس کے دوست کی مانوس آواز سے اُس کے کان بجنے لگے۔ وہ آواز چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ دوست ہمیں سخت امتحان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ہم ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ تمہیں ڈاکٹر بننا ہے اور مجھے انجینئر۔گلستان کے اندر عجیب قسم کی بے چینی پھیل گئی۔اُس کے ذہن نے سوچنا بند کر دیا۔

اُسے ہر طرف خون آلودہ پتھر نظر آنے لگے۔ وہ خاموشی کے ساتھ امتحان ہال سے باہر چلا آیا اور ''تلاشِ امن'' نامی کتاب میں پتھر چھپا کر سڑک کی جانب دوڑ پڑا۔شُتر کمینہ کی

گھنٹی بجتے ہی اُس کے کان بجنے لگے۔ نوکیلے پتھر کی چوٹ سے امن گروپ کے سردار کے سیاہ ماتھے سے سُرخیلے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ نفرت کی تیز لہر نے بندوق کا گھوڑا دبایا اور آن کی آن میں گلستان کا گلابی بدن برستے شعلوں سے جلنے لگا۔ وہ اپنے جلتے وجود کی پروا کئے بغیر غیرت کے گھوڑے پر سوار ہوا اور امن گروپ کے سردار کے جلادی چہرے پر ''تلاشِ امن'' نامی کتاب زور سے مارتے ہوئے بول پڑا۔ ''مکار.. ڈھوکے باز.. کیا یہی ہے تمہارا فلسفۂ امن..؟ کہ نہتے لوگوں کی فریادی سانسوں کو تشدد کی ننگی تلوار سے کاٹا جائے.. اور.. ماں کے مضروب دل کی مجبور دھڑکنوں کو پھانسی کے پھندے سے جکڑ دیا جائے..!''

خون بہنے کے ساتھ ساتھ اُس کے جذبات بھی سرد پڑ گئے اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے سڑک کے بیچوں بیچ زخمی حالت میں گر پڑا۔ بچوں نے جب گولیوں کی مانوس آواز سنی تو انھیں اپنی کتابوں میں لفظوں کے بدلے پتھر ہی پتھر نظر آنے لگے۔ وہ اسکول سے نکل کر بھاری بھاری بیگ ہاتھوں میں اٹھا کر دوڑتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ گلستان کے خوشبودار خون کی مہک فضا میں پھیلنے لگی۔ لوگوں نے گلستان کو زخمی حالت میں اسپتال پہنچا دیا۔ ڈاکٹر رات بھر اُس کو بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ اُس کی ماں رو رو کر اُس کے سر کو سہلاتی رہی۔ کالی رات کے آخری حصّے میں گھنٹی کی خوفناک آواز سے اُس کا دل بیٹھنے لگا اور اُس نے آخری مرتبہ ماں کی گود میں سر رکھ کر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا:

''ماں.. مجھے میرا زخمی دوست علاج کے لئے بُلا رہا ہے.. اُس کے جسم سے خون بہہ رہا ہے.. ماں.. مایوس مت ہونا.. اندھیرا بھاگ رہا ہے.. اور.. اور اُجالا آ رہا ہے..''

ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

پرندے پیڑوں پر خاموش ہو گئے اور اُس کی ماں کی قوت گویائی...!

○○○

گمشدہ سرمایہ

وہ تیسری بار سرکاری اسپتال میں ایڈمٹ ہوا تھا۔ میڈیکل رپورٹ پڑھتے ہوئے اُس کی آنکھیں نم ہوئیں۔ رپورٹ فائل کو بند کرتے سوچنے لگا کہ آج وہ زندگی کے اس پر کھٹن موڑ پر تنہا کھڑا ہے جہاں پر اُسے سہارے کی ضرورت ہے۔ اپنوں کے سہارے کی.. جن کا کیریئر بنانے کے لئے اُس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگایا تھا۔ بڑھاپے کے بھیانک خوف اور ہارٹ پرابلم کے خوفناک ڈر نے اُس کے دماغ کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اُس کی سوچ جب دماغ کے دو حصّوں کو جوڑنا چاہتی تو وہاں انتشار کا آتش فشاں پھٹ جاتا اور وہ مایوسی کے عالم میں خود کو پر شکستہ پرندہ تصوّر کرتا۔

اس کا کُنبہ بارہ نفوس پر مشتمل تھا جس میں اُس کے علاوہ اُس کے چار لڑکے، اُن کی بیویاں اور بچے شامل تھے۔ چاروں لڑکے دوسرے ملکوں میں جاب کرتے تھے۔ ان کو اعلیٰ تعلیم دلانے میں اُس نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ خود تو وہ ایک پینشن یافتہ پوسٹ مین تھا لیکن اپنے بچوں کے کیریر کو سنوارنے میں اُس نے اپنا تمام سرمایہ لٹا ڈالا تھا۔ وہ خود غرض قسم کا انسان نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ سمجھتا رہا کہ انسان کی زندگی ایک لمبی دوڑ کی طرح ہے جس میں والدین، بھائی بہنوں اور اپنی اولاد کے لئے پڑاؤ آتے ہیں اور انسان کو دوڑنے کے دوران تمام منزلوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس طرح سے زندگی کا یہ لمبا سفر بہتی ندی کی طرح آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اُس کے والدین جب تک حیات تھے وہ ہمیشہ ان کی نگاہوں میں ایک فرمانبردار بیٹا رہا اور ان سے دعائے خیر پاتا رہا۔ لیکن آج وہ خود زندگی کے اُس پڑاؤ پر پہنچا تھا جہاں اُسے اپنے بچوں کے سہارے کی ضرورت

محسوس ہورہی تھی۔ لیکن۔۔ اُس کے بیٹے اپنا اور اپنے بچوں کا مستقبل بنانے میں ایسے کھو گئے کہ ان کے ذہن سے شاید 'ماں باپ' جیسے عظیم لفظوں کا تصور تک 'گمشدہ شئے' کی طرح محو ہو گئے تھے۔ وہ برسوں پہلے بدیس چلے گئے' جہاں اُس کا ایک لڑکا نامور ہارٹ سرجن تھا اور دوسرے لڑکوں کا بھی اچھا خاصا بزنس تھا۔ وہ جب بھی ان کی لاپرواہی کے بارے میں سوچتا تو خود کو کوستا رہتا کہ شاید اُسی کی تربیت میں کچھ کھوٹ رہی ہوگی۔

اسپتال میں اُسے پڑے ہوئے کئی ہفتے گزر گئے۔ روز بروز اس کی بگڑتی صحت کو دیکھتے ہوئے ایک دن ڈاکٹروں نے کہا کہ اُسے ہارٹ سرجری کرنا پڑے گی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ یہ آپریشن امریکہ میں مقیم مشہور ہارٹ سرجن ڈاکٹر ارشد خان ہی کر سکتا ہے' جس کے لئے اُسے ایک لاکھ روپے بطور فیس ادا کرنا پڑے گا۔ ڈاکٹر ارشد کا نام سنتے ہی غفار خان کا چہرہ خوشی سے کِھل اٹھا' وہ فخریہ انداز سے خود کو دنیا کا سب سے بڑا خوش نصیب باپ سمجھنے لگا۔ اُسے وہ وقت یاد آیا جب ارشد کو امریکہ روانہ کرنے کے لئے اُس نے اپنے جی۔ پی۔ فنڈ سے پچاس ہزار روپے نکالے تھے اور پیسہ نکالتے وقت جب آفیسر نے اُس سے پوچھا تھا کہ ''غفار خان۔۔ اب تم ریٹائر ہو رہے ہو' بس بہت کم وقت بچا ہے۔ اپنے لئے کیا رکھو گے؟'' تو غفار خان نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

''جناب! میری زندگی کا اصلی سرمایہ میرے بچے ہیں۔ اگر میں اپنے پیسوں سے اپنے بچوں کو خوشیاں نہ دے سکوں تو یہ پیسے میرے کس کام کے۔۔؟''

چند دنوں کے اندر غفار خان نے امریکہ میں مقیم اپنے لختِ جگر ڈاکٹر ارشد خان سے فون پر رابطہ کیا اور اپنے آپریشن کے بارے میں بتایا۔ ارشد خان نے اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کا بہانہ بنا کر یہ کہتے ہوئے اپنا دامن چھڑا لیا کہ ''وہ آپریشن کے سلسلے میں ڈاکٹروں کو فون پر ہی ضروری معلومات فراہم کر دے گا۔'' اپنے مشہور ڈاکٹر بیٹے کا یہ مشورہ سُن کر غفار خان ٹھنڈا پڑ گیا' وہ لڑکھڑاتے ہوئے اسپتال کے زینے چڑھنے لگا جیسے بے یار و مددگار ہمالہ کی چوٹی سر کرنے پر مجبور ہو رہا ہو۔

ایک دن غفار خان کا چیک اپ کرتے ہوئے ڈاکٹروں نے اُسے بتایا کہ ''خوش قسمتی سے ڈاکٹر ارشد ایک آپریشن کے سلسلے میں آج امریکہ سے یہاں آرہے ہیں کیونکہ کل اُنہیں ایک منسٹر کے لڑکے کا آپریشن کرنا ہے جس کے لئے ڈاکٹر ارشد کے اکاونٹ میں دو لاکھ روپے جمع کر دیئے گئے ہیں۔'' ڈاکٹروں نے غفار خان سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے مزید کہا کہ ''اگر تم پیسوں کا انتظام کرسکو گے تو تمہارا آپریشن بھی کل ہوجائے گا۔''

یہ سنتے ہی غفار خان کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ کچھ کہہ نہ سکا، وہ سوچ رہا تھا کہ اُس کے پاس دوا خریدنے کے لئے ایک کوڑی بھی نہیں ہے یہاں تو ایک لاکھ کا مسئلہ ہے۔ غفار خان کا دوست رجب علی اس وقت وہاں موجود تھا۔ اُس نے غفار خان کی بے چین حالت دیکھ کر کہا کہ ''میرے دوست تم فکر مت کرو۔ تمہارے آپریشن کے لئے میں اپنے سخاوت سنٹر سے پیسوں کا انتظام کروں گا۔ تم ضرور ٹھیک ہوجاؤ گے۔'' غفار خان کو دلاسہ دے کر رجب علی ڈاکٹر ارشد کا انتظار کرنے لگا۔ چند گھنٹوں کے بعد جب رجب علی کو ڈاکٹر ارشد کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ گیسٹ ہاوس میں اُس سے ملنے چلا گیا۔ ڈاکٹر ارشد سے آپریشن کے سلسلے میں ٹائم مقرر کرنے کے بعد رجب علی واپس آکر غفار خان کے بیڈ پر بیٹھ گیا اور پُرمسرت لہجے میں کہنے لگا:

''ڈاکٹر ارشد سے تمہارے آپریشن کے بارے میں بات ہوئی۔ اُنہوں نے فیس میں بھی پچاس ہزار روپے کم کردئے۔ کل صبح سویرے وہ تمہارا آپریشن کرے گا۔''

یہ کہہ کر رجب علی نے جب غفار خان سے گھر جانے کی رخصت لی تو غفار خان کو محسوس ہونے لگا کہ ''اُس کا نور چشم آپریشن کرنے کے لئے رضامند نہیں ہوا ہے بلکہ پیسوں کی لالچ میں اپنے باپ کے دل کو کُند چھری سے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے تیار ہوا ہے۔'' یہ سوچتے سوچتے غفار خان کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی جو دھیمی دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی کہ ''آج ایک بیٹے نے اولاد کے فرض اور باپ کے حق کو سر عام نیلام

کر دیا۔"

غفار خان رات بھر افسوس کرتا رہا کہ اُس نے ایک انسان کو گھر سے باہر بھیجا تھا وہ وہاں جا کر کیسے حیوان بن گیا۔ صبح ہونے سے پہلے غفار خان یہ کہتے کہتے بیڈ پر لیٹ گیا کہ "نافرمان اولاد گمشدہ شے کے مانند ہوتی ہے۔" سویرے جب اسپتال کا عملہ غفار خان کو آپریشن تھیٹر میں لے جانے کے لئے وارڈ میں داخل ہوا تو وہ غفار خان کے ٹھنڈے جسم کو دیکھ کر مایوس ہو کر لوٹ گیا...

غفار خان نے زندگی کی اُداس دوڑ سے سحر ہوتے ہی چھٹکارا حاصل کر لیا تھا اور اُس کی کھلی آنکھیں کسی گمشدہ سرمایہ کے تلاش کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

ООО

سفید ہاتھی

(مزاحمتی افسانہ)

آسیب... گہری نیند کا آسیب... ان کی سوچ پر چھایا ہوا تھا۔ وہ... ان کی بے خودی دیکھ کر بے چین ہو رہا تھا اور ان بے حس سوچ رکھنے والوں کے بند پڑے دماغوں کے دریچوں کو کھولنے کی کوشش میں لگا رہتا لیکن بار بار کوشش کرنے کے باوجود اُسے کبھی کبھی محسوس ہوتا تھا کہ ان کے دماغ زنگ آلودہ سوچوں کے جمودی کھنڈرات بن چکے ہیں۔ وہ جب اندھیرے دنیا کی چھتوں پر بیداری کی روشن قندیلیں لٹکائے رکھتا اور ان کے گونگے پن کو آواز میں بدلنا چاہتا تو وہ ان کی آنکھوں میں بصیرت کے چراغوں کو ٹمٹماتے ہوئے، ان کی زبانوں کو بھی اندرونی گروہ بندی کے بکھیڑوں میں الجھنے کی وجہ سے ہکلے پن کا شکار پاتا۔ ان کے فرسودہ خیالات پر اُسے ترس آرہا تھا.. طوفان کے گھپ اندھیرے میں خیالی ابابیلوں کا انتظار.. خوش فہمی.. صرف خوش فہمی کا دھوکہ اور خوش فہمی کا نتیجہ.. مقدر کا سراب.. وہ سوچتا رہتا کہ خوابِ غفلت میں مست یہ مخلوق... سورج سنسار میں ہو رہی دھماکہ خیز تبدیلیوں سے بے پروا.. ماپنے اپنے پنجر نما بلوں کو گوشۂ عافیت سمجھنے کے فریب میں ڈوبتی چلی جا رہی ہیں۔ ان کند ذہنوں کا عالم ابھرتے ڈوبتے سورج کی گردش تک محدود ہو کے رہ گیا ہے۔ کارگاہ ہستی کے گھمسان رن میں ان کے اپاہج قدموں کی آہٹ بھانپ کر اور ان کے کھوکھلے لفظوں کی جھنکار سن کر.. اُس کا وجود لرز اٹھتا تھا۔ وہ چلاتا رہتا کہ کھوکھلے لفظوں کی تکرار بونوں اور بے ہمتوں کی نشانی ہوتی ہے۔ ان کی بے حسی کو کوستے ہوئے وہ انھیں ایسی جمادات نما مخلوق قرار دیتا جو صرف اُدھار سانسوں کا حساب رکھنا جانتی ہو۔ وہ ان کے خوابیدہ ذہنوں میں انقلاب

برپا کرنا چاہتا تھا لیکن ان کی سرد مہری دیکھ کر اسے یقین ہو جاتا تھا کہ یہ مخلوق تو رزم گاہ حیات میں کودنے سے خوف کھا رہی ہے اور صرف توکل کے نام پر حیات مستعار پر ہی قناعت کی متمنی ہے۔

سفید ہاتھی آندھی کی طرح ان کے گلستانوں کی طرف بڑھ رہے تھے اور ان کے کھیت کھلیانوں کو تباہ کرتے جا رہے تھے۔ وہ اپنی لمبی لمبی سونڈوں کی بدبودار سانسوں سے ان کے خوشبودار چمن زاروں کو زہر آلود کرتے جا رہے تھے اور اپنے پتھر جیسے بھاری پاؤں سے ان چمن زاروں کے رنگ برنگے پھولوں کو مسل رہے تھے۔

سفید ہاتھیوں کا یہ وحشی قافلہ عرصہ ہائے دراز سے ان پر حملہ آور تھا۔ یہ قافلہ اس جمادات نما مخلوق کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ، بڑے غور سے سفید ہاتھیوں کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ ان حملہ آور ہاتھیوں کے پیچھے ققنُس کا مسحور کن ساز بج رہا ہے اور اس ساز کی بدلتی آوازیں ہاتھیوں کی وحشیانہ سوچ پر اثر انداز ہو رہی ہیں.. مان کے وحشیانہ جذبات کو بھڑکا رہی ہیں اور ان کو اپنے مقصد کو پورا کرنے تک متحد رہنے کی صدائیں دے رہی ہیں۔

ساز کی دلفریب دُھنیں سفید ہاتھیوں کے جوش کو اُبال دینے میں مگن تھیں۔ سونڈوں سے شعلے برس رہے تھے جن کی لپٹوں سے مظلوم مخلوق کی تاریخی پناہ گاہیں' آگ کی خندقیں بن رہی تھیں اور تباہی مچانے کے بعد وہ بدمست ہاتھی محکوم مخلوق کے کنوؤں سے آب حیات پیتے ہوئے راحت محسوس کر رہے تھے۔

وہ.. مان سفید ہاتھیوں کے عزائم' ان کی ہمت اور مادّی مقاصد کے رازوں کو جاننے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ وہ یہ جان کر سخت حیران ہوا کہ نہ صرف ققنس کے راگ سفید ہاتھیوں کی رہنمائی کر رہے ہیں بلکہ پردے کے پیچھے چھپے کالے ناگ بھی پھن مارتے ہوئے انھیں آگے بڑھنے کے لئے اُکسا رہے ہیں۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ کالے ناگ تو اپنی فطرت پر برابر قائم ہیں یہ تو آستین کے سانپ ہی نکلے۔ مکاری اور

دغابازی کے جراثیم تو ان کی رگوں میں خون کی طرح گردش کر رہے ہیں..احسان فراموش...!

اس کی آنکھوں کے سامنے کالے ناگوں کا وہ دور گردش کرنے لگا جب ان کی دھرتی بنجر نما جنگل تھا..وہاں تہذیب وتمدن کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا..اس نیم مردہ مخلوق نے ہی ان کے چمن کو تہذیب وتمدن کا گہوارا بنایا تھا اور ان کی دھرتی ہیرے موتی اُگلنے لگی تھی ۔جن کی چمک دمک سے ان سفید ہاتھیوں کی آنکھیں سرخ ہو کر ان کے گلستان پر قابض ہوگئی تھیں ۔اس وقت ان بزدل کالے ناگوں کی ہمت اسی مظلوم مخلوق نے بڑھائی تھی جن کے خلاف آج یہ سفید ہاتھیوں کے ساتھ مل کر در پردہ سازشیں رچ رہے ہیں ۔اگر یہ کالے ناگ اپنی دھرتی سے آج بھی پوچھیں گے کہ تجھے آزادی کیسے نصیب ہوئی تو اُس دھرتی کی سچی تاریخ اس محکوم مخلوق کے کارناموں کو ضرور دہرائے گی...بنجر زمین کے یہ کالے ناگ سب احسان بھول بیٹھے...!

اس اندوہناک صورت حال کا مشاہدہ کر کے وہ دوبارہ بے حس مخلوق کو بیدار کرنے لگا۔ان کو تمام حقیقتوں سے باخبر کرنے لگا۔ وہ انھیں..ماں کے دورِ اقتدار کی داستانیں سناتا رہا اور انھیں چلا چلا کر پکارتا رہا کہ اٹھو! ان وحشی درندوں کو ماضی کی طرح سبق سکھاؤ۔اپنی بہادری اور جواں مردی کے جوہر دکھاؤ..تمہارے چمن کے چند بہادر شاہین پہلے ہی ان وحشیوں پر چھپٹ پڑے ہیں..ہوش میں آجاؤ..تم کمزور نہیں ہو... تم میں صرف اتحاد کا فقدان ہے۔متحد ہو کر ان بزدلوں پر ٹوٹ پڑو..اندھیرا مٹنے والا ہے اور اُجالا تمہارا انتظار کر رہا ہے..اٹھو! اپنے گلستانوں کو بچاؤ..اپنے نخلستان کو بچاؤ... یہ کہتے ہوئے وہ آسمان کی طرف آبدیدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

اُس کے اندر سے سرد آہیں نکل رہی تھیں ۔اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کی سرد آہوں سے افلاک کے پردے چاک ہو رہے ہیں۔ بارانِ رحمت کا نزول ہو رہا ہے اور چمن کے پھولوں کا نکھار بڑھ رہا ہے۔اُسے نظر آنے لگا کہ ٹھنڈی ہواؤں سے نیم

مردہ مخلوق کی بند پڑی آنکھیں آہستہ آہستہ کھل رہی ہیں اور بھینی بھینی خوشبوؤں سے ان کے دماغوں نے سوچنا شروع کر دیا اور ان کے جسم سفید ہاتھیوں کے شعلوں کی تپش محسوس کرتے ہوئے حرکت کرنے لگے۔

دھوپ نکلنے کے ساتھ ہی... وہ... دور دور تک چیونٹیوں کی لمبی لمبی قطاروں کو پھلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ سفید ہاتھیوں کی بدصورت سونڈیں کنوؤں سے آبِ حیات چُرانے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ چیونٹیوں نے مخصوص حکمت عملی کے تحت آہستہ آہستہ ان سونڈوں میں گھسنا شروع کر دیا اور ان کے دماغوں کو نوچ کر ان کے جسموں کو اندر ہی اندر کھوکھلا کرنے لگے۔ سفید ہاتھی اندرونی زلزلے سے تھرتھرا کر دھڑا دھڑ زمین پر گرنے لگے اور سازشی ققنس کا گلہ شاہینوں کے ڈر سے بیٹھے لگا اور وہ کرگسوں کی طرح چمن سے بھاگنے لگے۔ کالے ناگ اپنے حلیفوں کی یہ شکست خوردہ اور وحشت ناک صورتحال دیکھ کر بزدلوں کی طرح مکاری کے بِلوں میں چُھپ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے نیم مردہ مخلوق نے ایک طاقت ور قافلے کی صورت اختیار کر لی۔ چمن دوبارہ خوشبودار ہواؤں سے مہک رہا تھا اور... وہ... خوشی سے جھوم رہا تھا کہ اس کی صدائیں محکوم مخلوق کو جگانے میں 'بانگ درا' ثابت ہوئیں... وہ... انھیں شاباشی دیتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ وہ مردہ بن گیا تھا لیکن اب وہ زندہ ہے... زندہ...!

ooo

ناکہ بندی

(مزاحمتی افسانہ)

چار مہینے کا ننھا سا پھول دودھ کی ایک ایک بوند کے لئے ترس رہا تھا۔ اُس کی دلخراش چیخوں سے ماں باپ کے جگر پارہ پارہ ہو رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے ان کے کلیجے کو تیز تلوار سے کاٹا جا رہا ہو۔ بھوکے بچے کی ابتر حالت اور اپنی بے بسی و بے کسی کا رونا روتے روتے ساجدہ اور بشیر ملک کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ بنجر زمین کے بنجر ذہن آدی باسیوں نے سرسبز اور شاداب وادی کے بے مثل مہمان نواز انسانوں کا دانہ پانی بند کر رکھا تھا۔ کئی مہینوں سے چل رہی اقتصادی ناکہ بندی کے ٹوٹنے کے تمام راستے' بلوائیوں کے محسن جمہوریت پسند سیاستدانوں کی شاطرانہ مصلحت آمیزی اور جانبدارنہ پالیسوں کے بھنور میں پھنسے ہوئے تھے اور وادی کے طول وعرض میں قحط نما صورت حال تھی۔

''بشیر! مُنّا بے ہوش ہو گیا ہے۔'' ساجدہ نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ''کہیں سے آٹو کا انتظام کرو، اس کو اسپتال لے جائیں گے۔''

''اس اندھیری وحشت ناک رات میں ہم کس طرح گھر سے نکلیں گے۔'' بشیر ملک نے آنکھیں موندتے ہوئے کہا'' باہر کرفیو لگا ہوا ہے۔ صبح تک انتظار کرنا پڑے گا۔ پھر.. صبح کو بھی کون اسپتال جانے دے گا؟''

لیکن بشیر.. صبح..؟ ساجدہ کچھ اور نہ کہہ سکی۔

''ساجدہ! کسی پڑوسی سے مُنّا کے لئے دودھ اُدھار مانگ لو۔'' بشیر ملک نے کہا۔ ساجدہ غم ناک آواز میں بولی'' وہ لوگ مجھ سے ہی دودھ کے بارے میں پوچھ

رہے تھے۔ان کے بچے بھی بھوک سے بلک رہے ہیں۔"

کچھ دیر کے بعد فون کی گھنٹی بجنے لگی۔بشیر ملک نے ریسور اٹھایا۔جموں سے اُس کا چھوٹا بھائی عرفان ایک ہی سانس میں بول پڑا"بھائی جان!اندھیرے کا سہارا لے کر میں ٹرک لے کر جموں سے گزر رہا ہوں۔فکر مت کرنا!میں مُنّے کے لئے دودھ کی ایک پیٹی بھی لایا ہوں۔"بشیر ملک نے یہ بات جب ساجدہ کو بتائی تو اس کا چہرہ کھِل اٹھا۔

بشیر ملک نے کرسی پر بیٹھ کر تھوڑی سی راحت محسوس کی۔وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا اور گزرے دنوں کی خوشنما یادوں میں کھو گیا۔اسے یاد آیا کہ کس طرح ہم کشمیری اپنی جنت میں وارد مہمانوں کا استقبال بے مثل فراخ دلی سے کرتے تھے اور اپنی مہمان نوازی کے حسین نقوش ان کے دلوں پر چھوڑ کر بار بار یہ ثابت کرتے آئے ہیں کہ"ذرّہ ذرّہ ہے میرے کشمیر کا مہمان نواز۔"اُس کی آنکھیں نم ہورہی تھیں لیکن وہ اب کچھ اور ہی محسوس کر رہا تھا۔وہ سوچ رہا تھا کہ اس انسانی سلوک کے بدلے یہ لوگ حیوانیت پر اتر آئے ہیں، ان لوگوں نے اپنے زہر آلود منصوبوں سے وادی کے خوش نما اور خوبصورت پھولوں کو مسلنے کی قسم کھائی ہے۔ان کے خمیر میں ہی شاید منافرت کا زہر ملا ہوا ہے، نہیں تو یہ لوگ کیسے بھول جاتے کہ جب یہ لوگ کشمیر میں اپنے مذہبی مقامات پر زیارت کے لئے آتے تھے تو ہم لوگ جگہ جگہ ان کے لئے کھانے پینے کا اعلیٰ انتظام رکھتے تھے اور ماضی میں کئی بار جب موسم کی خرابی کی وجہ سے یہ لوگ مصیبت میں پھنس گئے تھے تو ہمارے گھر ان کے لئے بہترین اور پر امن پناہ گاہیں ثابت ہوئے اور آج یہی لوگ زمین کے وارثوں کو ہی کاشت کار بنانا چاہتے ہیں اور مکان کے مکینوں کو کرایہ دار..!

یہ لوگ پریشانیوں کی وجہ سے کئی راتوں سے سو نہیں پائے تھے۔رات کے آخری حصے میں جب بشیر ملک کی آنکھ لگ گئی تو صبح سویرے انھیں فون پر کسی دوست نے اطلاع دی کہ آج کسی رضا کار تنظیم کی طرف سے انسانی حقوق کے دفتر کے سامنے مِلک فوڈ بانٹا جائے گا۔بشیر ملک یہ سُن کر گھر سے تیزی کے ساتھ نکلا اور شہر کے تنگ گلی کوچوں

سے گزرتے ہوئے وہاں پہنچ گیا اور بڑی مشکل سے دودھ کا ایک ڈبہ حاصل کر پایا۔ اِدھر ساجدہ اپنے بے ہوش لختِ جگر کو لے کر اسپتال کی جانب دوڑ پڑی۔ وہ جب پریشان حالت میں سنسان سڑک کو پار کر رہی تھی کہ اچانک کہیں سے آواز آئی ''کرفیو میں کہاں جا رہی ہو؟''

ساجدہ خوف کے مارے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں آنسو بہاتے ہوئے بولی۔

''بچہ بیمار... اسپتال...!'' یہ سنتے ہی کئی وردی پوش سڑک پر نمودار ہو گئے۔

ساجدہ دہشت زدہ ہوئی۔ اُس نے بچے کو چھاتی سے لگایا۔

''اچھا! بیمار بچے کو اسپتال لے جانا ہے۔'' ایک وردی پوش بولا ''اسپتال جا کر کیا کرو گی وہاں تو دوائیں نہیں ہیں۔''

چند لمحوں بعد کہیں سے ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور بچے کے پھول جیسے نازک بدن کو چیرتی ہوئی ماں کے دل میں پیوست ہو گئی۔ چاروں طرف ہنسنے کی آوازیں آئیں اور خون میں لت پت دونوں لاشیں گھر کے صحن میں پھینک دی گئیں۔

بشیر ملک شہر کی گنجان آبادی سے چوری چھپے خوش ہو کر دودھ کا ڈبہ بغل میں چھپاتے ہوئے جب گھر کے مین گیٹ پر پہنچا، تو صحن میں داخل ہوتے ہی اُس کی نظر بیوی اور بچے کی لاش پر پڑی۔ وہ حواس باختہ ہو کر چیخنے چلانے لگا۔ اس کی چیخیں صدا بہ صحرا ثابت ہو رہی تھیں کیونکہ وردی پوشوں کے خوف نے تمام لوگوں گھروں کے اندر چُھپنے پر مجبور کر دیا تھا۔

عرفان جب رات کے اندھیرے میں چاول سے بھرا ٹرک کشمیر کی طرف لے کر آ رہا تھا تو بیچ سڑک پر اُسے بلوائیوں نے روکا۔ ترشول کی چمک اور خوفناک آوازیں ظاہر ہوئیں:

''ہر ہر مہادیو۔ وندے ماترم...''

بلوائیوں نے ٹرک پر حملہ کر کے سارا چاول لوٹ لیا اور عرفان کو ٹرک کے ساتھ

زندہ جلا ڈالا۔ بشیر ملک اس اندوہ ناک صورت حال سے بے خبر تھا۔ اُس نے عرفان سے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تا کہ وہ اسے گھر کے سانحہ کے بارے میں بتائے لیکن عرفان کا موبائل بند آرہا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد عرفان کے ایک ساتھی ڈرائیور کا فون آیا۔ اُس نے بشیر ملک کو عرفان کے حادثے کے بارے میں بتایا۔ یہ خبر سنتے ہی بشیر ملک کے اوپر جیسے دوہرا آسمان ٹوٹ پڑا۔ اُس کی آواز بند ہوگئی۔

کرفیو میں آدھے گھنٹے کی ڈھیل دی گئی۔ بشیر ملک گھر سے باہر نکلا اور بازار کی طرف چل پڑا۔ اُس کے ہاتھ میں دودھ کا ڈبہ تھا۔ کچھ لوگ سڑک پر جمع ہوگئے۔ بشیر ملک کے ہاتھ میں مِلک فوڈ دیکھ کر ایک آدمی سامنے آیا اور بشیر ملک سے پوچھنے لگا۔

''اے بھائی! تمہیں یہ دودھ کا ڈبہ کہاں سے ملا؟ کیا اسے بیچو گے؟''

بشیر ملک نے جب ہاں میں جواب دیا تو وہ آدمی حیران ہوکر بول پڑا۔

''لیکن کیوں! تمہیں بھی تو اپنے بچے کے لئے اس کی ضرورت ہوگی۔''

''میرے بچے کو اب اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ کفن کے انتظار میں ہے۔ جس کے لئے مجھے پیسہ چاہئے۔'' یہ کہتے ہوئے بشیر ملک کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار اُمڈ پڑی۔

اسی دوران لوگوں نے ناکہ بندی اور کرفیو کے خلاف پُرامن احتجاج شروع کیا۔ مظاہرین کو خاموش کرانے کے لئے وردی پوشوں نے ان پر گولیوں کی برسات کی۔ آدھے گھنٹے کی ڈھیل ختم ہوتے ہی دوسرے چند لوگوں کے ساتھ بشیر ملک کی لاش بھی گولیوں سے چھلنی سڑک پر کفن کا انتظار کر رہی تھی۔ اور قانون کی نظروں میں دھول جھونکنے کے لئے دودھ کے ڈبے کو بم بنا کر پیش کیا گیا...!

○○○

جشنِ قبرستان

بھیانک اندھیرے کے خوفناک سائے جب بستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے تو انسان تو انسان.. بستی کے حیوان بھی خوف کے مارے سہم کر رہ جاتے ۔ رات کے اندھیرے میں اٹھنے والی دہشت کی خوفناک آوازیں جب لوگوں کے دلوں پر اثر انداز ہو جاتیں تو پیرو جواں کی سوچوں پر وحشت کا سایہ چھا جاتا اور سوچ سمجھ کی قوت مفقود ہو جاتی ۔ خوف و ہراس کا یہ لمبا سلسلہ بستی کی حقیقی تاریخ کا حصہ بن چکا تھا۔ اندھیرے کا یہ خوف جب رات کے وقت بستی کے مکینوں کی دھڑکنوں پر چھا جاتا تو وہ لوگ اندھیرے کمروں میں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو دھیمی آواز میں قصہ کہانیاں سنانا شروع کر دیتے تا کہ وہ اور ان کے بچے زندگی کے پریشان اوقات میں کچھ دیر کے لئے سکون کے لمحات بھر سکیں۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد جب دادا جی نے حقہ بھر دیا تو گھر کے تمام بچے اُن کے سامنے کہانی سننے کے لئے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک جب دادا جی نے ان کی طرف غور نہیں کیا تو پانچ چھ سال کا مہذب اُن کے شانے پر سوار ہو کر بول پڑا'' دادا جی! کہانی سناؤ نا..!'' دادا جی نے اُسے اپنے شانے سے اتار کر سامنے بیٹھا دیا۔ زور سے حقے کا ایک کش لیا اور بے تاب بچوں سے پوچھنے لگے'' کونسی کہانی سننا پسند کرو گے؟''

''ہمیں جنوں اور پریوں کی کہانی نہیں سُننا ہے۔'' دس برس کے قیصر نے کہا'' ہمیں اس بھیانک اندھیرے میں دل دہلا دینے والی آوازوں کے بارے میں جاننا ہے۔''

قیصر کی انوکھی بات سُن کر دادا جی کے ذہن میں جیسے ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔

اُنہیں محسوس ہوا کہ اُن کی سوچ کی کشتی کو قیصر نے طوفان کے ایسے بھنور میں پھینک دیا جہاں وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں کہ اب اس کشتی کو خوفناک کہانی کے پتوار سے آگے کی طرف بڑھائیں یا نہیں۔ دادا جی کی سوچ کی کشتی ابھی اسی بھنور میں ہچکولے کھا رہی تھی کہ شاہدہ نے دادا جی کی کشتی کو یہ کہتے ہوئے پتوار عطا کی ''ہاں دادا جی! ہمیں اندھیرے کی کہانی سناؤ نا؟'' اب دادا جی کی ہمت بندھ گئی اور اُنہوں نے ارادہ کر لیا کہ وہ آج انھیں اس بھیانک اندھیرے کی کہانی ضرور سنائیں گے کیونکہ زندگی کا کیا بھروسہ، کب اپنا سفر ختم کرے۔ یہ سوچتے ہوئے دادا جی نے کہانی شروع کی۔

وہ ایک پُرسکون وادی تھی۔ اُس کے چمنستان رنگ برنگے پھولوں سے مہکتے تھے۔ ان پھولوں کی خوشبودار ہوائیں جب فضا میں پھیل جاتیں تو پہاڑوں کی دوسری جانب بسنے والے لوگوں کے دماغوں کو معطر کر دیتیں۔ اس وادی کی ایک شاندار تاریخ تھی۔ اس کی اپنی ایک تہذیب، اپنا ایک تمدن تھا اور سب سے بڑھ کر جو دولت ان کے پاس تھی وہ تھا ان کا اپنا ایک آزاد ماحول۔ یہ ماحول... بھائی چارے، انسان دوستی اور انسانیت کی روشنی سے چمکتا رہتا تھا۔ ''پھر کیا ہوا دادا جی۔'' شاہدہ نے بیچ میں کہا۔

''تم آرام سے سُنو۔'' دادا جی نے کھانستے ہوئے کہا۔

انسان جب لالچی بن جاتا ہے تو اُس کے اندر انسانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس خوشحالی کو لوٹنے کے ارادے سے لالچی انسانوں نے اس پر کبھی لشکر کشی کر کے اور کبھی مکاری اور چالبازی کا جال بچھانا شروع کر دیا۔ وادی کے لوگ کئی مرتبہ ان جابر اور لالچی انسانوں کو شکست دینے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن ان جابروں کی طاقت کے سامنے یہ کمزور انسان آخر کار ہار بیٹھے اور اس طرح وادی کے روشن دور پر بھیانک اندھیروں کے کالے سائے چھانے لگے۔ دادا جی نے یہ کہتے ہوئے یاسر کو حقے میں تمباکو ڈالنے کے لئے کہا۔ یاسر نے تمباکو ڈال کر اُسے سُلگاتے ہوئے کہا۔ ''دادا جی! کہانی ختم ہو گئی؟''

''نہیں بیٹے۔'' دادا جی نے کش لیتے ہوئے کہا ''یہ کہانی کی ابتداء ہے۔'' دادا جی

نے جونہی دوسرا کش لیا تو باہر اندھیرے کی خوفناک آوازوں سے کان کے پردے پھٹنے لگے۔ تمام لوگوں سے کہا جا رہا تھا کہ وہ کل چھبیس جنوری کی صبح وادی کے قبرستان میں جمع ہو کر بادشاہِ وقت کے ساتھ جشنِ قبرستان منائیں گے۔ تمام بچے یہ خوفناک آواز سُن کر سہم گئے اور دادا جی نے تمام بچوں کو یہ کہہ کر سونے کے لئے کہا کہ کل کہانی کا باقی حصہ قبرستان میں خود دیکھو گے۔

صبح سویرے، تمام لوگ قبرستان میں جمع ہوئے، دادا جی بھی بچوں سمت وقت پر پہنچ گئے۔ تمام لوگوں کے زرد چہروں پر خوف و ہراس کی ہوائیں اُڑ رہی تھیں۔ لوگوں کو سفید کپڑے پہننے کا حکم دیا گیا اور ہاتھوں میں خون سے بھرے گلاس تھما دئے گئے۔ بادشاہِ وقت آنکھوں پر دھوکے کی کالی عینک لگا کر ظلم کا جھنڈا الہرانے لگا۔ وہ جب لالچ کی کرسی پر بیٹھ گیا تو شاہی فرمان جاری ہوا کہ لوگ اپنی اپنی سنائیں۔

یہ اعلان سنتے ہی ایک بوڑھے شخص نے قبرستان سے اپنے نوجوان بیٹے کی خون آلود لاش نکالی اور اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا کر بادشاہ کے سامنے لایا۔ جونہی اس بوڑھے کے دل سے انصاف کی ایک سرد آہ نکلی تب ہی اُس پر شاہی کوڑوں کی بارش کی گئی۔ اُسے مجبور کیا گیا کہ وہ شاہی قانون پر عمل کرتے ہوئے اُس شاہی دربان کے گلے میں پھول کی مالا ڈالے، جس نے مشعل روشن کرنے کے جرم میں اُس کے نوجوان بیٹے کو مار ڈالا تھا۔ اُس مظلوم نے ایک ہاتھ سے اپنے بیٹے کی لاش کو تھامے رکھا اور کپکپاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اپنے بیٹے کے قاتل کے گلے میں مالا ڈال دی۔ ہر طرف ساز کی دھنیں بجنے لگیں اور بادشاہِ وقت نے دربان کو شاہی ایوارڈ سے نوازا۔

چند منٹوں کے بعد ادھیڑ عمر کی ایک خاتون کو حاضر ہونے کا حکم ملا۔ سسکیاں لیتے ہوئے وہ خاتون جب اسٹیج پر چڑھ گئی تو اُس نے سر سے سرخ رنگ کفن کا ایک گٹھا اُتار کر بادشاہِ وقت کے سامنے رکھ دیا۔ بادشاہ نے اپنے منہ پر رومال رکھتے ہوئے اشارے سے اس خون آلود کفن کو ہٹانے کا حکم دیا۔ کفن ہٹاتے ہی اُس بے کس خاتون کے ہاتھ

میں مٹھائی کا ایک ٹوکرا تھمایا گیا اور وہ آنسو بہاتے بہاتے ان درندوں پر مٹھائیاں ڈالنے پر مجبور کی گئی جنھوں نے اُس کی بیٹیوں کی پاک دامنی کو داغ دار کر کے انھیں موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

آخر بادشاہِ وقت کے سامنے ان معصوم بچوں کو ٹولیوں کی صورت میں لایا گیا جن کے والدین اندھیرے کو مٹانے کی کوشش میں مشعل روشن کرتے کرتے مارے گئے تھے۔ یہ یتیم بچے جب ناچتے ناچتے تھک کر گر جاتے تو ان کو یتیم بنانے والے قاتل اسٹیج پر تالیاں بجا بجا کر انھیں اور بھی ناچنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

جشنِ قبرستان کے ختم ہوتے ہی ہر طرف اندھیرا پھیلنا شروع ہوا اور خوفناک آوازوں کے ڈر سے لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگنے لگے۔ دادا جی جب بچوں کے ساتھ واپس گھر میں داخل ہوئے تو قیصر' دادا جی کو پانی پلاتے ہوئے پوچھ بیٹھا

''دادا جی! اس ظالم اندھیرے سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی ہے کہ نہیں؟''

دادا جی نے فرش پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا: ''ہاں میری آنکھ کے تارو... اندھیرے کو بھگانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ بستی کے گھر گھر سے مشعلیں روشن ہو جائیں ۔ ہر انسان بیدار ہو جائے اور اپنے اندر پوشیدہ خودداری کے جذبے کو ابھارے۔'' یہ کہتے ہوئے دادا جی نے روشن مشعل ہاتھ میں اٹھائی اور گرج دار آواز میں کہا:

''اور جب.. کوئی انسان.. انقلاب کی روشن مشعل ہاتھ میں اٹھا کر منزل کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو اندھیرا.. شکست کھا کر بھاگ جاتا ہے۔''

دادا جی کے اس انقلاب انگیز جذبے نے بچوں کے دل سے بھیانک اندھیرے کا خوف نکال دیا اور وہ کھڑے ہو کر روشن مشعل کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے یک زبان ہو کر بولے۔ ''دادا جی.. ہم سب روشن مشعل اٹھا کر بھیانک اندھیرے کو اپنی بستی سے بھگا دینے کی قسم کھاتے ہیں۔''

○○○

ٹوٹتی جوانیاں

(مزاحمتی افسانہ)

پبلک سروس کمیشن کی طرف سے سلیکشن لسٹ، جو ایک مقامی نیوز پیپر میں مشتہر ہوئی تھی، میں اپنا نام دیکھ کر میں بے حد خوش ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد میری پوسٹنگ شہر سے باہر وادی کے ایک دور افتادہ علاقے گلشن آباد کی گئی۔ ویسے تو میری خواہش شہر کی تھی لیکن میں پھر بھی مایوس نہیں ہوا، سوچا کہ ایک نسبت سے اچھا ہی ہوا۔ اس طرح اپنی اس گلپوش وادی کے پورے حُسن سے محظوظ بھی ہوں گے اور دور افتادہ علاقوں میں بسنے والے لوگوں کے رہن سہن اور زندگی گزارنے کے طور طریقوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ملے گا۔ دیہاتی لوگوں کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ دیہات میں ایک دہائی گزارنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اگر سادگی، ہمدردی، بھائی چارہ، خلوص اور شرم و حیا کو فطری صورت میں دیکھنا ہو اور ان انسانی خصائل کا حقیقی مشاہدہ کرنا ہو تو دیہات میں جانا چاہیے۔ ویسے تو شہر میں بھی یہ چیزیں ناپید نہیں ہیں لیکن گاؤں کے مقابلے میں شہر کی فضا ہی ایسی ہے کہ یہاں مصنوعیت اور مسابقت کا کچھ زیادہ ہی دور دورہ ہے۔

میری پوسٹنگ گلشن آباد کے پوشہ پورہ گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ہوئی۔ رات کے آٹھ بجے میں اسپتال پہنچا، چوکیدار سے چابی لے کر سیدھے کوارٹر میں داخل ہوا۔ اپنا لگیج وغیرہ کمرے میں رکھ کر پہلے نہایا، کچھ دیر کے بعد چوکیدار نے کھانا وغیرہ تیار کیا اور کھانا کھانے کے بعد میں سو گیا۔ صبح سویرے جاگنے کے بعد میں نے کمروں کی صفائی کروائی۔ قریباً دس بجے لوگوں کا ایک ہجوم اسپتال کے صحن میں نمودار ہوا۔ چوکیدار

میرے کمرے میں حاضر ہو کر بولا ''صاحب ! گاؤں کے لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں۔''میں نے چوکیدار سے کہہ کر انہیں اسپتال کی پارک میں ٹھہرایا اور کپڑے تبدیل کر کے میڈیسن کا بیگ ہاتھ میں اٹھا کر پارک میں آ گیا۔ پارک میں داخل ہوتے ہی گاؤں کی عورتوں نے گلابی پھولوں سے میرا استقبال کیا۔ تمام لوگوں کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ سب سے پہلے میرے سامنے دودھ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد ایک بڑا ٹوکرا سامنے رکھا گیا۔ جس میں مختلف قسم کے پھل' سبزیاں' انڈے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ مجھے اجنبیت کا قطعی احساس نہیں ہوا۔ میں نے اپنا تعارف کرانے کے بعد تمام گاؤں والوں کا شکریہ ادا کیا۔ گاؤں کے ایک بزرگ ماسٹر نے اپنے تعارف کے بعد تمام لوگوں کا تعارف کرایا۔

دن گزرتے رہے۔ میں دن بھر اخبارات اور رسائل پڑھنے میں مشغول رہتا تھا۔ کبھی کبھار ہی کوئی مریض اسپتال میں آتا تھا۔ گاؤں کے لوگ کافی محنتی ہوتے ہیں۔ وہ دن بھر کھیتوں میں کام کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا جسم چُست رہتا ہے۔ ان کی خوراک تازہ سبزیاں' چاول اور پھل ہوتے ہیں' اسی وجہ سے گاؤں میں رہنے والے لوگ کم ہی بیمار پڑتے ہیں۔ ایک صبح جب میں ابھی بستر پر ہی لیٹا ہوا تھا کہ باہر سے ہر طرف چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں جلدی بستر سے اٹھا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ اسپتال کے احاطے میں گاؤں کے بیشتر لوگ جمع تھے۔ میں نے بہت ساری لڑکیوں کو رسیوں سے بندھا پایا۔ لڑکیاں پاگلوں کی طرح اپنے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کر رہی تھیں اور عجیب و غریب آواز میں ''دیکھو ہمارا یہ گلستان جس کی ہم ہیں کلیاں'' گا رہی تھیں۔ میں یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر بدحواس سا ہو گیا اور دوڑتے ہوئے ان لوگوں کے پاس پہنچا۔ ''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے طیش میں آ کر ایک نوجوان کو تھپڑ مارتے ہوئے پوچھا۔ اسکول ماسٹر جلدی سے سامنے کھڑا ہوا اور تیز لہجے میں بولا۔

''ڈاکٹر صاحب ! پہلے آپ ان سب لڑکیوں کو بے ہوشی کا انجکشن لگائیے۔ بعد

میں ہم بتا دیں گے۔''

ان لڑکیوں کا علاج کرنے میں پورا دن گزر گیا۔ دن بھر میں سوچتا رہا کہ ان سیدھے سادھے اور ملنسار لوگوں کو کس آفت نے آج گھیر لیا اور یہ مصیبت ان پر کیوں ٹوٹ پڑی ۔ دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ تقریباً تمام لڑکیاں اپنی اصلی حالت میں آگئیں ۔ میں کوارٹر میں چلا گیا۔ چائے وغیرہ پینے کے بعد میں بیڈ پر تھکان دور کرنے کے لئے لیٹنے ہی والا تھا کہ گاؤں کا بزرگ ماسٹر اپنی جوان سال بیٹی کو ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ میں اس دلدوز واقع کی وجوہات جاننے کے لئے ویسے ہی بے قرار تھا اس لئے جلد ہی پوچھ بیٹھا ''ماسٹر جی! یہ کیا ماجرا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ میں اس گاؤں میں ہمیشہ انسان دوستی' بھائی چارہ' امن و امان اور انسانیت ساز ماحول دیکھتا آیا۔۔لیکن۔۔۔؟''

ماسٹر جی میری بات کاٹتے ہوئے روتے روتے کہنے لگا۔

''یہ میری جوان بیٹی ہے۔ یہ لگ بھگ پینتیس برس کی ہے جن دوسری لڑکیوں کا علاج کرنے میں دن بھر آپ مصروف رہے۔ وہ چالیس لڑکیاں بھی تقریباً اسی عمر کی ہیں۔''

''لیکن ان سب لڑکیوں کی یہ حالت آج ہی کے دن ایک ساتھ کیسے ہوئی؟''

میں نے ماسٹر جی کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

میرے پوچھنے پر ماسٹر جی کی بیٹی زار و قطار رونے لگی اور اپنے لوگوں کی درد بھری کہانی سنانے لگی۔

''ڈاکٹر صاحب آج ''یومِ فتح کی تاریخ ہے۔ آج ہی کے دن ہمارا اعظیم گلستان غیروں کی غلامی سے آزاد ہوا ہے۔ اسی دن۔۔ہاں۔۔ماسی یومِ فتح کے دن۔۔بیس سال پہلے' جب میری عمر سولہ برس تھی، ہم لوگ یومِ فتح کا جشن منا رہے تھے' اپنے والد صاحب کے ساتھ ایک مہینے تک میں گاؤں کی لڑکیوں کو یومِ فتح کے دن پروگرام پیش

کرنے کی تیاریوں میں مصروف رہی ۔ یومِ فتح کی تقریب منانے کے سلسلے میں تمام گاؤں والے اسپتال کے وسیع احاطے میں موجود تھے۔ گلستان کے پاسبان اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے۔ فتح کا پرچم لہرایا گیا۔ ہر طرف خوشی کا سماں تھا۔ میں گاؤں کی لڑکیوں کو فتح کے گیت پڑھا رہی تھی ۔لڑکیاں بھی ترنم کے ساتھ بلند آواز میں ''دیکھو ہمارا یہ گلستان جس کی ہم ہیں کلیاں'' گا رہی تھیں کہ اچانک زوردار زلزلہ آیا۔ بہت سارے گاؤں والے اور کچھ پاسبان اس زلزلے میں مر گئے ۔ چارسو سناٹا چھا گیا۔ ہم یومِ فتح کا جشن منا رہے تھے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ زلزلہ کیسے آیا۔ تمام پاسبان حواس باختہ ہو گئے ۔ جو لوگ ابھی تک اسٹیج پر ہماری امن پرستی کی قسمیں کھا رہے تھے۔ اچانک انہیں ہم سب سے بڑے امن دشمن نظر آنے لگے۔ تمام بستی کھنڈرات میں تبدیل ہو گئی۔ گلستان کے پاسبانوں نے سرعام لوٹ مار اور بربریت کا ننگا ناچ کھیلا اور نازک کلیوں کو ظالم گلچیں نے مسل کر رکھ دیا۔'' ماسٹر جی کی بیٹی اس انسانیت سوز سانحہ کا ذکر کرتے ہوئے بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑی۔ ہم نے اُسے بیڈ پر لٹا دیا۔

''ڈاکٹر صاحب ! یہ ہے اس سانحہ کی روداد۔'' ماسٹر جی نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''پچھلے بیس برسوں سے گاؤں میں کسی بھی لڑکی کی ڈولی نہیں اٹھی کیونکہ گلستان کے دلیر پاسبانوں نے ان کی عزت لوٹ کر جو سیاہ دھبے ان کے پاک دامن پر لگا دیئے۔ زمانے کی گردش نے ابھی تک وہ صاف نہیں کئے ۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے 20 برسوں سے ظلم کا شکار ہوئی ہماری لڑکیاں یومِ فتح کے دن اپنے حواس کھو بیٹھتی ہیں اور ہمیں مجبوراً انہیں رسیوں سے جکڑنا پڑتا ہے۔''

ماسٹر جی کی بیٹی بے ہوشی کے عالم میں ''دیکھو ہمارا گلستان جس کی ہم ہیں کلیاں'' گا رہی تھی ۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ آج محبت سے نہیں بلکہ نفرت کی وجہ سے یہ پڑھ رہی ہے اور اُس کے دل میں انتقام کا آتش فشاں پک رہا ہے۔

کھ کھ

ڈپریشن

شبِ ظلمات کا نصف سے زیادہ حصہ بیت گیا تھا۔صابر کی ماں نے لالٹین کی بتی جلائی اور صابر کو نیند سے جگاتے ہوئے کہنے لگی ''صابر بیٹا اُٹھونا' جلدی کرو نہیں تو دیر ہوجائے گی' پھر شہر کیسے جاؤ گے۔''

صابر تیس برس کا نوجوان... پوسٹ گریجویٹ... عجیب قسم کے ذہنی تناؤ کا شکار... شہر جانے والی گاڑی خوفناک آواز میں ہارن بجا بجا کر سواریوں کو اپنی طرف بلا رہی تھی۔ لوگ گھپ اندھیرے میں بس کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔صابر جب گاڑی میں سوار ہوا تو گاڑی سواریوں سے کھچا کھچ بھری پڑی تھی۔اُسے مشکل سے بیک سیٹ پہ جگہ مل گئی۔ سانسیں درست کرنے کے بعد اُس نے بغل والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا:

''بڑی مشکل سے سیٹ مل گئی۔حاکم الوقت عوام کی مشکلات کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتے' ہر وقت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

بغل میں بیٹھا آدمی قریباً ستر برس کی عمر کا تھا۔وہ صابر کی بات سُن کر بڑی سنجیدگی سے بولا: ''نوجوان! ہم کون سا کام اپنی مرضی کے مطابق کر سکتے ہیں۔نصف صدی سے لوگ اس بس میں سفر کرتے آئے ہیں۔اس زنگ آلود بس کے زہر آلودہ ماحول میں سفر کرتے ہوئے دم گھٹتا ہے۔نہ جانے کتنے مسافر منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی اس بس میں دم توڑ بیٹھے۔خیر آپ شہر کیوں جا رہے ہیں۔آپ کے چہرے سے تو پسینے چھوٹ رہے ہیں، خیریت ہے نا؟''

''جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے تب سے میں عجیب وغریب ذہنی تناؤ میں مبتلا ہوں'' صابر نے درد بھری آواز میں کہا'' سنا ہے کہ شہر کے ایک اسپتال میں دنیا کے پانچ بڑے ماہرینِ نفسیات نے ایک بڑا کیمپ لگایا ہے۔ جہاں پر وہ ڈپریشن کے شکار انسانوں کا نفسیاتی معائنہ کرتے ہیں تاکہ وہ ذہنی تناؤ سے چھٹکارہ پا کر سکون کی سانس لے سکیں۔''

اسی دوران ڈرائیور اور کنڈیکٹر بس میں نمودار ہو گئے۔ ڈرائیور کے ماتھے پر لمبا سرخ ٹیکا تھا اور کنڈیکٹر کے چہرے پر لمبی داڑھی تھی۔ دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک لمبا کوڑا تھا.. بس شہر کی جانب چل پڑی' ہر طرف خوف کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ موسم اگرچہ خوشگوار تھا' پرندے بھی آزاد فضاؤں میں اُڑ رہے تھے لیکن بس کی بدبودار فضا سے مسافر سخت کوفت محسوس کر رہے تھے۔ گھٹن سے تنگ آکر کچھ نوجوانوں نے بس کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کو کھولنے کی کوشش کی تاکہ سڑک کے دونوں جانب پھیلی ہوئی پہاڑیوں سے آرہی ٹھنڈی اور خوشبودار ہوائیں مسافروں کی گھٹن کم کر سکیں۔ لیکن.. ابھی نوجوان کھڑکیاں کھولنے ہی لگے تھے کہ اچانک بس رُک گئی اور ڈرائیور اور کنڈیکٹر نے ان نوجوانوں پر کوڑے برسانا شروع کر دئے۔ بس میں افراتفری مچ گئی۔ بہت سارے نوجوان' بوڑھے' بچے اور عورتیں کوڑوں کی مار سے اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔ ہر طرف خون ہی خون نظر آرہا تھا اور بس ایک جیل کا انٹروگیشن سیل محسوس ہو رہی تھی۔

یہ وحشت ناک صورت حال دیکھ کر صابر کو دل کا دورہ پڑنے لگا۔ اُسے محسوس ہونے لگا کہ بس کی پٹرول ٹنکی میں ان لوگوں کا خون جمع ہو رہا ہے اور اُسی خون سے بس آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ سوچتے سوچتے صابر کو اپنے اسکول کے دن یاد آئے جب وہ پانچویں میں پڑھتا تھا اور ماسٹر جی روز انھیں مارننگ اسمبلی میں ایک نظم پڑھاتا تھا

''ہم ہوں گے کامیاب.. ہم ہوں گے کامیاب.. ایک دن...''

صابر نے ایک روز معصومانہ لہجے میں ماسٹر جی سے پوچھا تھا کہ ماسٹر جی اس نظم کا مطلب کیا ہے؟''

ماسٹر جی نے بڑے پیار سے سمجھایا تھا ''بیٹا، جب تم پڑھ لکھ کر بڑے ہو جاؤ گے تو تمہیں اپنے لئے اور اپنے وطن کے لئے بہت کچھ کرنا پڑے گا تا کہ تمہارا وطن ترقی کر سکے اور لوگ آزادی کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔''

صابر سوچتا رہا... سوچتا رہا کہ ابھی ہمیں ہماری منزل نہیں ملی ہے... ہمیں اور آگے بڑھنا ہے۔

بس شہر پہنچ گئی۔ صابر نے بس سے اتر کر سیدھے اسپتال کی راہ لی۔

اسپتال میں وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ بس کے تمام مسافر نفسیاتی مرض میں مبتلا تھے اور وہ علاج کے لئے قطار میں کھڑے اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔

صابر بھی قطار میں شامل ہو گیا۔ وہ تمام چہروں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

ایک عورت پاگل پن کا شکار لگ رہی تھی وہ چلا چلا کر دردناک آواز میں اپنے لڑکے کا نام لے رہی تھی اور کبھی کبھی بے ہوش ہو جاتی تھی کچھ لوگ اُسے زور سے پکڑے ہوئے تھے۔ صابر نے اس عورت کی قابلِ رحم حالت دیکھ کر ان لوگوں سے پوچھا کہ ''اس عورت کی یہ حالت کیسے ہوئی ہے۔ اُسے ایسا کون سا صدمہ پڑا ہے جس سے یہ اپنا دماغی توازن تک کھو بیٹھی ہے۔''

ان لوگوں میں سے ایک آدمی نے اُس عورت کی درد بھری کہانی سناتے ہوئے کہا۔

''نوجوان! اس عورت کا ایک جوان لڑکا تھا.. اُس نے اچھی خاصی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کو خوشحال دیکھنا چاہتا تھا اور ان کی مشکلات کو دور کرنا چاہتا تھا۔ وہ لوگوں کو بیدار کرنے کا متمنی تھا تا کہ ان کی آنے والی نسل آزاد فضاؤں میں سانس لے سکے۔ لوگ اُس بہادر اور انقلاب پسند نوجوان کے خیالات اور عزائم سے اتفاق کرنے لگے۔ ایک دن وہ اپنے علاقے کے لئے نئی بس لایا۔

لوگ اُس بس جوق در جوق سوار ہوتے گئے لیکن ابھی بس چند ہی میل کا سفر طے کر پائی تھی کہ برسوں پرانی چلنے والی بس کا ڈرائیور سڑک پر نمودار ہوا اور اُس نے بہادر نوجوان کو

بس سے اتار کر کوڑے مار مار کر ابدی نیند سُلا دیا۔''

یہ درد بھری کہانی سن کر صابر کا سر چکرانے لگا۔

اُس نے کھڑکی کھولی اور تازہ ہوا کے جھونکوں میں لمبی لمبی سانسیں لینے کی کوشش کی۔

اُسے یوں لگا کہ باہر سارے شہر میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ آسمان سے خون کی بارش ہو رہی ہے۔۔ لوگوں کی چیخ و پکار سے ساری وادی لرز رہی ہے۔۔۔

اور دور سڑک کے کنارے اُس کا وہ بوڑھا ماسٹر جی بھی خون میں لت پت پڑا ہوا ہے جو اُسے بچپن میں ''ہم ہوں گے کامیاب'' کی نظم پڑھایا کرتا تھا۔

یہ حواس باختہ صورتحال دیکھ کر صابر کا صبر بھی ٹوٹ گیا اور کچھ دیر بعد اس کی سسکیاں چیخ و پکار میں مل گئیں اور اُس کا ڈپریشن۔۔۔!

ooo

ہوم لینڈ

وہ جنت نما وادی تھی۔ اس کے پاسبان برف سے ڈھکے ہوئے.. آسمان کے حریف بلند و بالا خاموش پہاڑ تھے۔ بہار کے موسم میں جب سورج کی کرنیں ان برفیلے پہاڑوں پر پڑتی تھیں تو برف پگھل کر ٹھنڈے پانی میں تبدیل ہو کر بلندی سے پستی کی طرف مدھم آواز میں دھیرے دھیرے سفر شروع کرتی تھی اور اس گلپوش وادی کے چمن زاروں کے رنگ برنگے پھولوں کے لئے آبِ حیات کا کام انجام دیتی۔ یہ وادی ایک منفرد تہذیب و ثقافت کا مسکن رہی تھی جو صدیوں کی تاریخ پر مشتمل تھا۔ لوگ مختلف مذاہب کے پیروکار تھے لیکن انسانیت نوازی سب کا مشترکہ مذہب تھا۔ عبداللہ خان، سوم ناتھ اور سردار سرجیت سنگھ.. ہندو، مسلم اور سکھ اتحاد کی پائیدار علامت تھے۔ ان لوگوں نے زندگی کی ستّر بہاریں دیکھی تھیں۔ یہ ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے اور زمانے کے نشیب و فراز میں بھی یہ لوگ اتحاد و اتفاق کی بے مثل علامت تھے۔ الگ الگ مذہب سے تعلق رکھنے کے باوجود یہ لوگ ایک ہی کنویں سے پانی پیتے تھے اور ایک ہی کھیوٹ سے فصل اُگاتے تھے۔ گاؤں میں ایک بہت بڑا صدیوں پرانا چنار تھا۔ یہ تینوں اس چنار کے سائے میں غمِ روزگار پر گفتگو کرتے۔ یہ چنار اس علاقے کے لوگوں کا صدیوں پرانا ورثہ تھا اور امن کی علامت بھی، کیونکہ جب بھی بستی میں بدامنی کا کوئی واقعہ پیش آتا تھا تو بستی کے لوگ مل جل کر اس چنار کے سائے میں بیٹھ کر بدامنی کو امن میں تبدیل کرتے تھے۔

عبداللہ، سوم ناتھ اور سردار سرجیت سنگھ بچپن کے ساتھی تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بے حد محبت کرتے، محبت کی یہ روایت بزرگوں کی دین تھی۔ گاؤں میں جب بھی کوئی مذہبی تہوار ہوتا تو مشکل سے ہی پہچان ہوتی کہ یہ کس مذہب کا تہوار ہے کیونکہ سب لوگ ہر تہوار مشترکہ طور پر مناتے تھے اور آپسی بھائی چارے کا یہ عالم تھا کہ جب سوم ناتھ کی شادی رچائی گئی تو سوم ناتھ کے ساتھ عبداللہ خان اور سردار سرجیت سنگھ ہی اس کے سسرال گئے تھے اور دلہن کو سجا کر ڈولی میں لائے تھے۔

ایک دن... گھنے چنار کے سائے... سوم ناتھ نے بھائی چارے کی اس مضبوط روایت کو یہ کہہ کر توڑ ڈالا کہ ''وہ یہ وادی چھوڑ رہا ہے۔'' عبداللہ خان اور سرجیت سنگھ یہ خلاف توقع بات سن کر دم بخود ہو گئے۔ انھیں محسوس ہوا کہ اس بڑے چنار کی ایک پرانی شاخ کو خزاں کے سایوں نے اپنی لپیٹ میں لینا شروع کیا ہے۔ عبداللہ خان نے غصے میں آ کر سوم ناتھ سے پوچھا۔

''سوم ناتھ! تم کیوں اس صدیوں کے بھائی چارے کو توڑنا چاہتے ہو؟ تم ہمیں چھوڑ کر مت جاؤ۔''

''نہیں عبداللہ بھائی۔'' سوم ناتھ نے درد بھری آواز میں کہا ''ہم کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنوں سے سندیش ملا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے تم وادی چھوڑ کے چلے آؤ۔ میرا دل بھی اس جنم بھومی کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے لیکن جب برادری کے دوسرے لوگ بھاگ رہے ہیں تو میں یہاں اکیلا کیا کروں گا۔''

سوم ناتھ کی یہ باتیں سن کر سردار سرجیت سنگھ آگ بگولہ ہو گیا اور تلوار ہوا میں لہراتے ہوئے بول پڑا۔

''سومے! ہم لوگ صدیوں سے اکٹھا رہتے آئے ہیں۔ ہمارے بزرگ بھی ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے، کس کی مجال ہے جو ہم کو جدا کرے اور ہمیں اپنے گھروں سے بے گھر کر دے۔ مجھے بھی اپنوں سے پیغام آیا تھا لیکن میں نے جانے سے انکار

کر دیا۔ہم تینوں آنے والے طوفان کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔''

سوم ناتھ خیالات کے سمندر میں کھو گیا۔اس کو سکھ دکھ کے وہ دن یاد آ گئے جو اِن تینوں نے ایک ساتھ گزارے تھے۔اسے برسوں پہلے کا وہ واقعہ بھی یاد آیا جب قبائلوں نے وادی پر حملہ کر دیا تھا اور عبداللہ خان نے اس کے خاندان کو ایک مہینے تک اپنے گھر میں رکھا تھا تاکہ ان پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔سوم ناتھ نے عبداللہ خان کے چہرے کی طرف جب دیکھا تو اُسے عبداللہ خان کا وہ احسان بھی یاد آیا جب اسپتال میں اس کے بیٹے کو بچانے کے لئے عبداللہ خان نے اپنا خون پیش کیا تھا۔شام ڈھلتے ہی تینوں دوست اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹ چلے۔

صبح سویرے عبداللہ خان چنار کے سایہ تلے ان دونوں ہم وطنوں کا انتظار کرتا رہا۔کافی دیر کے بعد سردار سرجیت سنگھ نمودار ہوا۔سردار نے جب سوم ناتھ کو وہاں نہیں پایا تو وہ دونوں ایک دوسرے کو حیرت سے تکنے لگے۔دونوں سوم ناتھ کے گھر کی طرف چل پڑے۔وہاں ہر طرف خاموشی تھی' گھر کے دروازے پر تالا چڑھا ہوا تھا۔سوم ناتھ رات کے اندھیرے میں بھائی چارے کی صدیوں پرانی زنجیر کو کاٹ کر پہاڑی کی دوسری جانب فرار ہو کر اپنوں کے پاس چلا گیا تھا۔لیکن وہ یہ سچائی بھول بیٹھا تھا کہ پیڑ جب اپنی زمین سے اکھڑ جاتا ہے تو پرائی زمین اُس کی جڑوں کو پھلنے پھولنے نہیں دیتی ہے۔سوم ناتھ کی گائے بدحواسی کے عالم میں صحن کے اندر چکّر کاٹ رہی تھی۔عبداللہ خان،سوم ناتھ کی گائے کو امانت سمجھ کر گھر لے آیا۔

وقت گزرتا رہا۔دن مہینے اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے گئے۔وادی میں ہر طرف خوف و دہشت کا ماحول چھایا ہوا تھا۔وطن کی آن بچانے کی خاطر سینکڑوں لوگوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ہزاروں گھر جلائے گئے' راتیں موت کا منظر پیش کرتی رہیں اور دن میدان جنگ کا سماں! گھر سے نکلنے کے بعد کسی کو یہ امید نہیں ہوتی تھی کہ وہ دوبارہ گھر زندہ آئے گا یا نہیں؟ اس سب کے باوجود عبداللہ خان اور سردار

سرجیت سنگھ کا بھائی چارہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔

چند برسوں کے بعد عبداللہ خان کے نام سوم ناتھ کی ایک چٹھی آئی۔ عبداللہ خان چٹھی لے کر سردار سرجیت سنگھ کے گھر چلا گیا۔ سردار چٹھی کھول کر پڑھنے لگا۔ سوم ناتھ نے عبداللہ خان کو لکھا تھا:

''مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی جو میں نے دوسروں کے بہکاوے میں آکر اپنے آپ کو مصیبت کے بھنور میں جھونک دیا۔ وہاں آپ لوگ ہماری بہو بیٹیوں کی عزت بھی کرتے تھے اور حفاظت بھی! لیکن یہاں جنہیں ہم اپنا سمجھتے رہے وہ ہماری بہو بیٹیوں کی طرف ہوس بھری نظروں سے دیکھتے ہیں اور ہمیں مائیگرنٹ کہہ کر ہر مقام پر ذلیل کرتے رہتے ہیں۔''

عبداللہ خان اور سرجیت سنگھ خط پڑھتے پڑھتے بڑی دیر تک روتے رہے۔ سوم ناتھ نے عبداللہ خان کو مزید لکھا تھا:

''عبداللہ اگر آپ مجھ پر رحم کھاؤ، تو میرا آبائی مکان جلا ڈالو تا کہ میں سرکار سے معاوضہ لے سکوں اور انشورنس کمپنی سے پیسے وصول کرلوں اور میری زمین بھی بیچ ڈالو کیونکہ میرے بیٹے پرتھوی کو آرمی میں آفیسر کا عہدہ مل گیا ہے، اس لئے اب اسے ٹریننگ پر جانا ہے جس کے لئے مجھے پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔ آپ کا مجھ پر اور میرے بیٹے پر بڑا احسان رہے گا۔ اگر آپ میرا یہ کام کرو گے۔''

عبداللہ خان نے گھر آکر اپنے بیٹے غزنوی سے مشورہ کیا کہ ''سوم ناتھ کا مکان، ان کی امانت ہے، اسے ہم کیسے جلا سکتے ہیں، وہ اگر واپس آئیں گے تو کہاں رہیں گے۔ اس کے بدلے میرے پاس کچھ پیسے ہیں اور سوم ناتھ کی آدھی زمین ہم بیچ ڈالیں گے۔'' چند دنوں کے اندر عبداللہ خان نے سوم ناتھ کو پیسے بھیج دیئے۔ ایک مہینے کے بعد سومناتھ کا ایک پارسل عبداللہ خان کو پہنچ گیا، جس میں زمین کے کاغذات کے علاوہ ایک چٹھی بھی تھی جس میں سوم ناتھ نے لکھا تھا کہ ''ہم لوگ آپ کا احسان زندگی بھر نہیں

بھولیں گے۔ پرتھوی نے نوکری جوائن کر لی، یہ سب آپ کی مخلصانہ مدد سے ہوا۔''

ایک رات سوم ناتھ کے گھر سے اچانک آگ نمودار ہوئی۔ تمام گاؤں والے آگ بجھانے کے لئے دوڑ پڑے لیکن آگ پر قابو نہ پا سکے۔ کچھ مہینوں کے بعد سردار سرجیت سنگھ کو سوم ناتھ کا ایک خط موصول ہوا' جس میں لکھا تھا کہ میں نے مکان کا انشورنس کمپنی سے حاصل کر لیا ہے اور سرکار کی طرف سے معاوضہ بھی ملا ہے۔ اب تم مکان والی زمین خرید لو' کاغذات میں چند دنوں کے اندر بھیج دوں گا۔ سرجیت سنگھ نے زمین خرید کر اس پر ایک عالیشان مکان تعمیر کروایا اور کچھ ہی برسوں میں سوم ناتھ کی زمین پر ایک قصبہ نما گاؤں تعمیر ہوا۔

تقریباً بیس برس گزر گئے۔ وادی کے حالات اب کچھ حد تک سدھر گئے تھے۔ ایک روز لوگ جب صبح سویرے نیند سے جاگے تو سارے علاقے کو فوج نے اپنے گھیرے میں لیا تھا۔ دوپہر کے وقت کریک ڈاؤن کا اعلان ہوا اور تمام لوگوں کو اپنے اپنے گھروں سے بھیڑ بکریوں کی طرح نکالا گیا اور ایک کھلے میدان میں جمع کیا گیا۔ فوج کا افسر جب بڑے رعب داب کے ساتھ لوگوں کے سامنے کھڑا ہو گیا تو لوگ خوش بھی ہوئے اور حیران بھی۔ یہ افسر سوم ناتھ کا لڑکا پرتھوی تھا۔ پرتھوی مائک ہاتھ میں اٹھائے لوگوں سے مخاطب ہوا:

''ہم لوگ پچھلے بیس برسوں سے جن بدترین حالات کا شکار ہوتے آئے ہیں' اس کے ذمہ دار تم لوگ ہو۔ تم ہی لوگوں نے ہمیں اپنے گھروں سے بے گھر کر دیا۔ ہمارے مکان جلائے' ہماری زمینوں پر ناجائز قبضہ کر ڈالا۔ اب ہم واپس آنا چاہتے ہیں۔ ہم تم لوگوں کو ایک مہینے کی مہلت دیتے ہیں' تم لوگ ہماری زمینوں کو چھوڑ دو... یہاں پر ہمارا ہوم لینڈ بنے گا۔''

لوگ پرتھوی کی دل آزار باتوں سے برہم ہو گئے۔ عبداللہ خان لاٹھی کے سہارے پرتھوی کی طرف بڑھ گیا اور اُسے سمجھانے لگا کہ ''بیٹا تم لوگ ضرور واپس آؤ

لیکن ہم پر غلط الزامات مت لگاؤ۔'' یہ سنتے ہی پرتھوی نے اپنی گن سے عبداللہ خان کے دو دانت توڑ دیئے۔لوگ پرتھوی کی وحشیانہ حرکت دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئے۔ ہر طرف شور مچا۔ظلم کے خلاف نعرے بلند ہوئے۔۔بھیڑ میں عبداللہ خان کا لڑکا غزنوی کھڑا ہو گیا۔وہ پرتھوی سے جارحانہ لہجے میں کہنے لگا:

''تم لوگ اپنی جنم بھومی کو دھوکہ دے کر اور صدیوں کے بھائی چارے کو توڑ کر یہاں سے فرار ہوئے ہو۔تم لوگوں نے خود اپنے مکان جلوائے اور اپنی زمین ہمیں بیچ ڈالی ۔تم لوگوں نے اس پوتر دھرتی کو تیاگ دیا۔اب ہم لوگوں کے راستے الگ ہو چکے ہیں۔''

یہ سنتے ہی فوجی لوگوں پر ٹوٹ پڑے ۔سینکڑوں لوگ زخمی ہو گئے۔ پرتھوی لوگوں کو ایک مہینے کی مہلت دے کر وہاں سے چل دیا۔

ایک مہینے کے بعد پرتھوی جب اس علاقے میں دوبارہ آیا تو وہاں کا ماحول بدل چکا تھا۔بستی کے چوراہے پر ایک بڑا بورڈ لگایا گیا تھا جس پر سبز حروف سے آزاد لینڈ لکھا ہوا تھا اور علاقے کے نوجوان اپنے ہاتھوں میں ہتھیار تھامے ہوئے تھے جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ حالات...!

○○○

ببول کے کانٹے

پرنسپل کے ٹیبل پر کالج کی تمام ضروری فائلیں تہہ در تہہ پڑی ہوئی تھیں اور پرنسپل ایک ایک کر کے فائلوں کو چیک کر رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور چہرے پر مایوسی کے آثار نمایاں تھے۔ تمام فائلیں صحیح ہونے کے باوجود نہ جانے کیوں پرنسپل کچھ زیادہ ہی ڈپرس دکھائی دے رہا تھا' حالانکہ چند دنوں پہلے ہی بہترین کارکردگی کے اعتراف میں 'یو۔جی۔سی' کی ٹیم کی طرف سے اس کالج کو 'گریڈ۔اے' کے زمرے میں لایا گیا تھا اور خود پرنسپل کو اس کی ایمانداری اور اپنے پیشے میں اچھی کارکردگی کے عوض کئی ایوارڈز سے نوازا گیا تھا۔ اُس کے بہت سارے شاگرد اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور انھیں پرنسپل کے شاگرد ہونے پر فخر تھا۔ لیکن آج اُسے سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ جس کالج میں وہ شان سے قدم رکھتا تھا آج کالج کے احاطے میں قدم رکھتے ہوئے اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کسی بڑے قید خانے میں داخل ہو رہا ہے' اُس کا آفس جیل کا پنجرہ بن گیا ہے اور وہ خود کوئی بڑا مجرم ہے جس کو آج سزا ملنے والی ہے۔ اُس کا ذہن اُستاد کے مقدس پیشے کے بارے میں سوچنے لگا کہ سماج میں استاد کا رتبہ سب سے برتر مانا جاتا ہے اور قوم کو بنانے میں ایک استاد کلیدی رول ادا کرتا ہے اور اُس کی تعلیم و تربیت ہی سے ایک آدمی' انسان بن جاتا ہے۔ پرنسپل کا ذہن ابھی اسی ادھیڑبن میں الجھا ہوا تھا کہ چپراسی نے آفس میں داخل ہو کر منسٹر کی آمد کی اطلاع دی۔ یہ سنتے ہی اُس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہونے لگا۔

آج وزیر تعلیم کو کالج کا دورہ کرنا تھا۔ وزیر تعلیم نے چند مہینے پہلے ہی اپنی وزارت کا قلمدان سنبھالا تھا اور یہ اُس کا پہلا دورہ تھا۔ یہ منسٹر چند سال پہلے اس کالج میں زیر تعلیم تھا۔ وہ ایک بڑے سیاسی لیڈر کا لڑکا تھا اور کالج میں ہمیشہ غنڈہ گردی کرتا رہتا تھا۔ کئی بار کالج کے اسٹاف اور اسٹوڈنٹس نے پرنسپل کے سامنے اُس کی غیر شائستہ حرکتوں کی شکایت کی اور پرنسپل بھی اُس کو سُدھرنے کی نصیحتیں کرتا رہا لیکن وہ اپنی بُری عادت سے باز نہیں رہا۔ آخر کار ایک دن اُسے کالج سے نکالا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ امتحان کے دوران جب اُسے نقل کرنے سے روکا گیا تو وہ غنڈہ گردی پر اُتر آیا اور پرنسپل کے گریبان پر ہاتھ بھی ڈالا۔ یہ غنڈہ گردی کی انتہا تھی۔ اُسے پولیس کے حوالے کیا گیا اور ساتھ ہی بیڈ کریکٹر کی سرٹیفکیٹ بھی اُس کے ہاتھ میں تھما دی گئی۔

وقت گزرتا گیا۔ الیکشن کا وقت قریب آرہا تھا۔ ایک سیاسی پارٹی کی طرف سے اُسے منڈیٹ ملا اور الیکشن جیتنے کے بعد اُسے وزیر تعلیم بنایا گیا۔

منسٹر بڑے کروفر کے ساتھ پرنسپل کے آفس میں داخل ہوا۔ اُس کے ساتھ دوسرے کئی بڑے افسران بھی تھے۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے کالج کا ریکارڈ طلب کیا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک افسران نے ان فائلوں کا بغور جائزہ لیا۔ تمام افسران نے ریکارڈ صحیح ہونے کی تصدیق کی اور اپنی رپورٹ منسٹر کے سیکرٹری کے حوالے کردی۔ سیکرٹری نے یہ رپورٹ منسٹر کو تفصیلاً بتادی۔ رپورٹ سننے کے بعد منسٹر نے پرنسپل سے تیز لہجے میں پوچھا:

''ہمارے پاس شکایت آئی ہے کہ اس کالج میں نقل کی وبا پھیل چکی ہے۔ امتحان کے دوران ہر ایک لڑکے سے پیسہ لیا جاتا ہے اور پھر انھیں نقل کرنے کی چھوٹ دی جاتی ہے، جس کی وجہ سے اس کالج کا رزلٹ دوسرے کالجوں کے مقابلے میں ہمیشہ اچھا نکلتا ہے، آپ لوگ سرکاری کرسی کا غلط استعمال کرتے ہو۔''

''یہ سراسر غلط الزام ہے، اس کالج کا جو بھی طالب علم اچھے نمبرات لے کر پاس

ہوتا ہے وہ اساتذہ کی محنت اور اس طالب علم کی قابلیت کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ نقل کرنے کی چھوٹ ۔ ویسے تو آپ خود اس بارے میں اچھی طرح سے جانتے ہیں۔'' پرنسپل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ وضاحت کردی۔

یہ سنتے ہی منسٹر کا چہرہ غصے سے لال پیلا ہو گیا اور پرنسپل کو معطل کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ ایک پریس رپورٹر نے جب اس معاملے پر پرنسپل سے کچھ کہنے کو کہا تو پرنسپل نے اپنے آفس سے نکلتے ہوئے کہا۔

''سیاست ایک ببول کے پیڑ کی طرح ہے جس کے نوکیلے کانٹوں کو عوام جانے انجانے میں اپنے ووٹوں سے تاج کی صورت عطا کرتے ہیں اور کاغذی پیرہن پہنے ہوئے لوگ صرف زخمی ہو جاتے ہیں۔''

OOO

کشمیر نواز

زمینِ حُسن خیز کی پر سکون و جان بخش فضائیں.. قرنوں سے.. کالے دیوؤں کے آسیب سے سحر زدہ ہو رہی تھیں۔ یہ آفت زدہ وادی' کشمیر نواز کے سنہرے خوابوں کی حسین تعبیر تھی اور اُس کی ستم زدہ نسل' ایک مدت سے' کالے دیوؤں کے حکم جابری کی تابعداری کرتے ہوئے' جھیل ولر کی منجمد سطح کے اوپر ننگے بدن ننگے آسمان تلے سرما کی جان لیوا سردی میں برف کا بُت بنی ہوئی تھی۔ سرما کی برف باری کی وجہ سے 'جھیلِ ڈل' کا پانی جم گیا تھا اور اس ٹھٹھرتی سردی میں کالے دیو وادی کے باشندوں کو اپنے عذاب سے تڑپا رہے تھے۔ جھیل ڈل کی اس یخ بستہ سطح پر وہ لوگ برفیلے پیڑ جیسے لگ رہے تھے۔ کالے دیوؤں کا ڈر ان لوگوں کے دلوں میں اس طرح سے بیٹھ گیا تھا کہ ہونٹوں پر جمی ہوئی برف کو چوسنے سے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ کشمیر نواز اپنی برفیلی جسم والی نردوش نسل کی بے بسی دیکھ کر اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُس کی اس خوب صورت پھولوں بھری وادی کے مالی کب تک برف کے یہ سفید کفن اوڑھے رہیں گے۔ کون انھیں ان کالے دیوؤں کے آسیب سے نجات دلائے گا۔ اب کوئی 'کیشپ رِشی' نہیں آئے گا.. کوئی کیشپ رِشی نہیں..! کشمیر نواز کا ذہن یہ سوچتے سوچتے ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔

ماضی کے پردوں میں کشمیر نواز کو وہ دور نظر آیا جب وادی کے چاروں طرف پانی ہی پانی پھیلا ہوا تھا اور لوگ کشتیوں میں زندگی گزارتے تھے۔ لوگ زیادہ تر مچھلیوں کا

شکار کرتے تھے اور آرام سے زندگی گزارتے تھے۔ اس زمانے کے کالے دیوؤں کو ان لوگوں کی خوشحالی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس لئے وہ آہستہ آہستہ وادی کے لوگوں کو ستانے پر اتر آئے۔ کالے دیورات کے اندھیرے میں لوگوں کے گھروں پر شب خون مارتے تھے اور ان کے معصوم بچوں کو اُن کے والدین سے زبردستی چھین کر جھیل ڈل کے گہرے پانی میں پھینک دیتے تھے۔ وادی کے لوگ جب ان کالے دیوؤں کے جور وستم سے تنگ آگئے تو شب خیزی میں نکلنے والی اُن کی مظلوم آہوں کا درد اُس زمانے کے پیغمبر حضرت سلیمانؑ نے محسوس کیا' وہ ان مظلوموں کی فریاد رسی کے لئے اپنے تخت پر سوار ہو کر وادی کی جانب آئے اور اپنا اُڑن کھٹولا کوہِ سلیمانی پر ٹھہرایا۔ لوگ جوق در جوق حضرت سلیمانؑ کے پاس اپنی فریاد لے کر پہنچے اور انھیں کالے دیوؤں کے ظلم وستم کی روداد سُنائی۔ لوگوں کی فریاد سُن کر حضرت سلیمانؑ نے تمام جنّات کو حکم دیا کہ آج سے وہ کسی بھی آدم زاد کو نہیں ستائیں گے اور جو مظالم ان دیوؤں نے آج تک وادی کے لوگوں پر ڈھائے تھے' سزا کے طور پر انھیں وادی میں موجود سارے پانی کو نکالنے کا حکم دیا جاتا۔ لوگوں نے حضرت سلیمانؑ کا شکریہ ادا کیا اور اُسے اُس وقت کی زبان میں ''کشف ریشی'' کے نام سے یاد رکھا۔

کشمیر نواز کی سوچ ابھی ماضی کے واقعات میں ہی گم تھی کہ اچانک اُسے ہر طرف چیخ و پکار سنائی دی۔ اُس نے جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ کالے دیو اُس کی نوجوان نسل پر آگ کے کوڑے برسا رہے ہیں۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اگر یہ لوگ اسی طرح ظلم سہتے رہیں گے تو میری یہ خوابوں کی وادی معصوم آوازوں کا مدفن بنتی جائے گی۔ وہ کوہِ سلیمانی کی جانب دوڑ پڑا۔ پہاڑ کے اوپر پہنچ کر وہ اُس جگہ کو کھودنے لگا جہاں پر ماضی میں حضرت سلیمانؑ کا اڑن کھٹولا ٹھہرا تھا۔ زمین کھودتے ہوئے اس کے ہاتھ حضرت سلیمانؑ کی جادوئی انگوٹھی لگ گئی۔ اس نے انگوٹھی کو کڑاہی میں پگھلایا اور سینکڑوں نئی انگوٹھیاں بنا ڈالیں۔ وہ ان انگوٹھیوں کو پہاڑ سے نیچے پھینکتا گیا اور وادی کے ستم رسیدہ

لوگوں کے حوصلوں کو بڑھاتا رہا۔ اس کی آواز ہر طرف گونج رہی تھی وہ اپنے لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ ''جاگو! ان انگوٹھیوں کو پہنو... اپنے سرد پڑے خون میں حرارت بھر دو... آگ کے بدلے آگ بن جاؤ...!''

تمام لوگوں کے منجمد جسم حرکت میں آنے لگے۔ انگوٹھیاں پہنتے ہی ان کے اندر ایک نئی حرارت پیدا ہوئی اور ان کے برفیلے کفن پگھلنے لگے۔ وہ ایک نئے جوش اور ایک نئے ولولے کے ساتھ ان کالے دیوؤں پر ٹوٹ پڑے۔ انگاروں سے انگارے ٹکرانے لگے۔ کشمیر نواز پہاڑ پر اپنی نسل کی جرأت کو داد تحسین پیش کر رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ برسوں کے بعد اس کی وادی سے جابرانہ اقتدار کا خاتمہ ہو رہا ہے اور کالے دیو پسپائی کے عالم میں خوف زدہ ہو کر پہاڑی کے غاروں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔

○○○

کبھی الوداع نہ کہنا

(رومانی افسانہ)

فصل گل کی عنبریں فضاؤں میں پہلگام کے برف پوش کہساروں کی یخ بستہ سِلوں کو جب سورج کی تپتی کرنیں اپنی تپش سے چیرنا شروع کرتی ہیں تو پہاڑوں کی فرازی سے جھر جھر کرتے ہوئے ٹھنڈے آبشار نشیب میں منتظر پیاسی سرسبز وادی کے لئے آب حیات کے مترادف ہوتے ہیں۔ اور دنیا کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے سیلانی اپنی پیاس بجھاتے وقت ان برفیلے پہاڑوں کو قدرت کے 'سولر ریفریجرٹر' کے طور پر محسوس کرتے ہیں۔ وہ دونوں.. پہلگام کی ان برفانی پہاڑیوں کے سرسبز اور شاداب دامن میں تین سال بعد جُدا ہو رہے تھے۔ ان کی بہار کے سر پر خزاں کا سایہ منڈلا رہا تھا۔ ان دونوں کے جدائی کے گرم گرم آنسوؤں سے تیز دھار ندی کے بہاؤ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کالج کے لڑکے اور لڑکیاں ان مست فضاؤں میں ایسے جھوم رہے تھے کہ جیسے بہشت کی قمریاں اور آزاد چمن کے بلبل ہوں۔ ساجد اور ساجدہ ندی کے کنارے گم سُم بیٹھے آنے والے طوفان کے کرب سے لرز رہے تھے۔ ان خوش گوار نظاروں میں جہاں ہر ایک کالج اسٹوڈنٹ چہک رہا تھا وہاں ساجدہ کے ہونٹوں سے سرد آہ کے ساتھ کسی دل جلے شاعر کا یہ شعر نکل رہا تھا۔

برفیلی ہوائیں ہیں ، برفیلی فضائیں ہیں
اِک ہم ستم رسیدہ' اس پر یہ ادائیں ہیں

''یہ محبت ہم دونوں کی زندگی میں ایک حسین خواب کی طرح کیوں آئی..؟''
ساجدہ نے ساجد کے کاندھے پر سر رکھ کر روتے بلکتے مایوس لہجے میں کہا'' کیوں

تقدیر ہمیں زہریلی جدائی کا غم سہنے پر مجبور کر رہی ہے۔''

ساجد یہ سُن کر جذباتی ہو کر بول پڑا۔''محبت.. محبت.. اس کی حقیقت اُسی کے ذہن میں اثر انداز ہو سکتی ہے جس کو زندگی میں اس حسین بلا سے واسطہ پڑا ہو۔ ہمارے والدین ذہنی طور پر سماجی رسم و رواج کے اسیر ہیں۔ وہ شادی بیاہ کو ایک سماجی رسم سمجھتے ہیں نہ کہ دو دلوں کا ملن۔ وہ اپنی خاندانی روایت کو فخر کے جھوٹے پردے میں آگے بڑھاتے ہوئے ہمارے معصوم ارمانوں کا خون کر رہے ہیں۔''

تین برس ان دونوں کے لئے تین صدیوں کے مانند تھے۔ یہ دونوں کالج کے بیتے ہوئے دنوں کی رسیلی یادوں میں کھو گئے۔ ان کی پہلی ملاقات کالج کے پہلے دن کالج لائبریری میں ہوئی تھی۔ پہلے پہلے دونوں ایک دوسرے کو خاموش نگاہوں سے تکتے رہے لیکن چند مہینوں میں ان کی دوری قربت میں تبدیل ہوتی گئی اور وہ ایک دوسرے کو مخصوص انداز سے سمجھنے لگے۔ ساتھ ساتھ مطالعہ کرنے کے علاوہ یہ دونوں سمیناروں میں بھی اکٹھا حصہ لینے لگے اور کلاسز بھی ایک ساتھ اٹینڈ کرتے رہے۔ دو سال کے اندر وہ ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کو اچھی طرح سمجھ پائے تھے اور تیسرے سال یعنی گریجویشن کے آخری سال دونوں نے ڈگری حاصل کرنے کے بعد اپنی محبت کو شادی کے بندھن میں باندھنے کے سنہرے خواب دیکھنے شروع کئے۔

لیکن یہ خواب اس وقت سراب دکھائی دیا جب ایک دن ساجد کی ماں نے اسے کہا کہ تمہارے ابا جان نے تیری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ سنتے ہی ساجد کا سر چکرانے لگا۔''مجھ سے پوچھے بغیر میری شادی کا فیصلہ؟'' ساجد نے جذباتی انداز میں کہا ''اور ہاں! لڑکی پڑھی لکھی ہے یا ان پڑھ...؟''

''ان پڑھ ہے ان پڑھ! کچھ بھی نہیں پڑھا ہے۔'' ساجد کا باپ یہ کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔''مجھے معلوم ہے کہ تُو ابھی کماتا نہیں ہے لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی میری ریٹائرمنٹ ہونے میں پندرہ برس کا عرصہ ہے۔'' باپ کے یہ

فرسودہ خیالات ساجد کے سر پر ہتھوڑا مارنے کے برابر تھے۔

''ابا جان! کمانے والی بات نہیں ہے۔ میرے بھی کچھ خواب ہیں، کچھ خواہشیں ہیں.. شادی تو ضرور کرنی ہے لیکن میں اپنی پسند کے مطابق کسی پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کروں گا۔''۔ یہ کہتے ہوئے ساجد نے اپنا سر جھکا لیا۔

''تمہارے خواب.. تمہاری خواہشیں... ہمیں ان سے کچھ لینا دینا نہیں۔'' ساجد کے باپ نے دھمکی بھرے انداز میں کہا'' میں نے تمہارا رشتہ اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں طے کرلیا ہے۔ اگر تم نے انکار کردیا تو سماج میں میری کیا عزت رہے گی۔''

''ابا جان! شادی کا معاملہ زندگی سے جڑا ہوتا ہے۔ یہ آنے والی نسل کا مسئلہ ہوتا ہے۔'' ساجد گھر والوں کو سمجھانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ چند دنوں کے بعد ساجد کے باپ نے اپنی جھوٹی انا کی خاطر ساجد کے جذبات اور خواہشات کا سودا کر کے شادی کی تاریخ مقرر کرڈالی۔

اُس دن ساجد پہلگام کی حسین وادی میں ندی کنارے ساجدہ کو اپنی محبت کا بے رحم انجام سناتے سناتے جدائی کے درد سے اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا۔ بے خودی کے عالم میں دونوں ندی کے اوپر والے پل کے درمیان چلتے چلتے پہنچ گئے۔ انھیں محسوس ہونے لگا کہ جیسے پہلگام کی برفیلی پہاڑیوں سے آگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور برف پگھلنے سے ندی میں طغیانی آئی جس کی وجہ سے پل بیچ میں ٹوٹ گیا اور یہ دونوں ندی کے بہتے ہوئے پانی میں ڈوب گئے اور تیز دھار طوفان نے دونوں کو الگ الگ کناروں پر پھینک دیا۔

ساجد کی شادی کے بعد ساجدہ کی شادی بھی دوسرے شہر میں کردی گئی۔ دس سال بعد ساجد نے پی ایچ ڈی مکمل کرلیا اور اسی کالج میں بحیثیت لیکچرر تعینات ہوا جہاں سے اُس نے گریجویشن کی تھی۔ جوائن کرنے کے لئے جب وہ کالج کے آفس میں پہنچا تو ساجدہ کو وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ساجدہ بھی آج ہی جوائن کرچکی تھی۔ جوائننگ رپورٹ ڈالنے کے بعد وہ دونوں اسی پیڑ کے نیچے کرسیاں لگا کر بیٹھ گئے جہاں گریجویشن

کے دنوں وہ سبزے پر بیٹھ کر فرصت کے لمحات میں اپنے حسین مستقبل کے خوابوں کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ ''ساجد کیسے ہو؟'' ساجدہ نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا ''ان برسوں میں مجھ سے کبھی بھی ملنے کی کوشش نہیں کی۔''

''کس لئے ملنے کی کوشش کرتا؟'' ساجد نے سرد لہجے میں جواب دیا ''ہمیشہ اپنے مقدر پر رونا آتا ہے.. تم اپنی سناؤ۔ کتنے بچے ہیں۔''

''ساجد ان دس برسوں میں بہت کچھ بدلا۔'' ساجدہ یہ کہتی ہوئی رو پڑی ''جس کے ساتھ میری شادی ہوئی تھی وہ بزنس کرتا تھا اور مجھے اعلیٰ تعلیم کا شوق تھا جس کے لئے وہ تیار نہیں تھا۔ گھر میں ہمیشہ لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے تھے اور قسمت نے چند ہی مہینوں میں ہم دونوں کو جُدا کر دیا۔ اب صرف تنہائی اور میں..!''

کالج کے اسٹوڈنٹس نے دوسرے دن پہلگام جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اسٹاف کی طرف سے ساجد اور ساجدہ کو اسٹوڈنٹس کے ساتھ روانہ کیا گیا۔ دونوں پہلگام پہنچ کر دس برس پہلے والی جگہ ندی کے کنارے بیٹھ گئے۔ فضا خوشگوار تھی۔ پھول مہک رہے تھے اور تتلیاں ان کے اردگرد چکر لگا رہی تھیں۔ ندی کا پل آج بھی ٹوٹا پڑا تھا۔ دونوں کی نظریں ٹوٹے ہوئے پُل پر مرکوز تھیں۔ پُل شاید سوچ رہا تھا کہ ان دونوں کی جدائی کی وجہ سے وہ ٹوٹ گیا تھا اور دس سال تک وہ اس لئے انتظار کرتا رہا کہ یہ دونوں اس کی دوبارہ تعمیر کا باعث بنیں گے۔ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر پل کی طرف قدم بڑھانے لگے۔ پہلگام کی سرسبز و شاداب وادی میں پھر سے بہار اپنا جلوہ دکھانے لگی۔ اور ہواؤں نے گلاب کے پھولوں سے ان دونوں کا سواگت کیا جس کے لئے وہ برسوں سے انتظار میں تھے۔ ریڈیو سے غزل چل رہی تھی ۔

مرے تخیل کی تنگ دنیا تیرے تصور سے ہے فروزاں
تجھے گماں ہے کہ میں ابھی تک تِری تمنا میں جی رہا ہوں

○○○

اپنا سورج

(مزاحمتی افسانہ)

بادِ صرصر اچانک نمودار ہوجاتی اور مہکتے چمن کے پھولوں کی سرخ گلابی پتیوں کو ریزہ ریزہ کر کے گرد وغبار میں بکھیر دیتی۔ بادِ صرصر کی اس طوفانی آمد سے ڈر کر جب بچے اپنے بزرگوں سے پوچھتے کہ یہ تیز وتند ہوا گلابی موسم میں نمودار ہوکر ہمارے چمن کے خوبصورت پھولوں کو کیوں بھری جوانی میں فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہے تو بزرگ لوگ اپنے بچوں کی سوچ کے مطابق جواب دیتے کہ ہماری وادی کا سورج اونچے اونچے پہاڑوں کے پیچھے پھیلی ہوئی ایک گہری کالی جھیل کی یخ بستہ دبیز تہوں میں پھنسا ہوا ہے اور شیش ناگ اپنے زہریلے پھنوں سے اُس کی چمکتی کرنوں کو دھویں میں تبدیل کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے چمن تک اتنی ہی سورج کی دھوپ پہنچتی ہے جتنا شیش ناگ چاہتا ہے۔ اسی لئے جب بھی بادِ صرصر چاہتی ہے تو ہمارے چمن کی طرف رخ کرتی ہے اور یہاں تباہی مچاتی ہے۔

وہ جب کچی عمر کا تھا تو بادِ صرصر کی طوفانی آمد کے ساتھ ہی اُس کا دھیان بزرگوں کی سنائی ہوئی طلسماتی کہانی کی طرف فوراً چلا جاتا۔ بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی عقل میں بھی پختگی آنے لگی۔ وہ ہسٹری پڑھنے کا بڑا شوقین تھا کیونکہ بچپن سے اُس کے کان طلسماتی قصہ کہانیاں سنتے آئے تھے۔ ہسٹری پڑھنے کے ساتھ ساتھ اُس کا ذہن جغرافیہ کی طرف بھی مائل ہوتا چلا گیا۔ وہ ہسٹری اور جغرافیہ میں کالی جھیل اور شیش ناگ کی حقیقت ڈھونڈتا رہا لیکن اُسے نہ کسی ہسٹری میں کسی کالی جھیل کا ذکر ملتا اور نہ ہی

جغرافیہ میں کسی شیش ناگ کا کوئی روپ نظر آتا تھا۔ وہ آزاد سوچ کا مالک تھا اور حقیقت پسند بھی۔ وہ سوچتا رہتا کہ جب سورج کے دہکتے شعلوں کو کوئی بھی جھیل سرد نہیں کر سکتی ہے اور نہ کسی شیش ناگ کے پھن اس کی چمکتی کرنوں کو کالا بنا سکتے ہیں تو ہماری وادی کے موسم ہی کیوں یک رنگی کے شکار نظر آ رہے ہیں۔ سورج تو روز آزادی کے ساتھ نیلے آسمان کے پردے پر ڈوبتا ابھرتا رہتا ہے اور دھرتی کے ذرّے ذرّے کو اپنی کرنوں سے چمکاتا رہتا ہے۔

وہ سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ کئی دہائیوں تک سوچتا رہا اور سوچتے سوچتے وہ اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھتا گیا۔ پہاڑوں پر چڑھ کر وہ اپنے سورج کو ڈھونڈنے لگا۔ اُس کی نظریں کالی جھیل کے گہرے پانی پر پڑیں۔ جہاں پر اُس کا سورج جھیل کی دبیز تہوں میں مایوس چھپا ہوا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے سورج کو اس جھیل کی جابرانہ تہوں سے آزاد کرے گا۔ اُس کی سوچ کے ساتھ دوسرے لوگوں کی سوچیں بھی شامل ہو گئیں اور یہ سوچیں فضائے بسیط میں پرواز کرنے لگیں۔ ان کی سوچیں ایک ساتھ اپنے ناخنوں سے جھیل کی دبیز تہوں کو کریدنے لگ گئیں۔ ان کی حِس ان سے کہہ رہی تھی کہ سخت سے سخت بادِ مخالف بھی متحدہ سوچ کی طاقت کو منتشر نہیں کر سکتی ہے۔

وہ لوگ اپنے پھنسے ہوئے سورج کو آزاد کرانے کے لئے اپنی متحدہ سوچ کے نوکیلے ناخنوں سے طلسماتی جھیل کی یخ بستہ تہوں کو کریدنے کی کوشش کرنے لگے اور کئی تہوں کو کرید کر جب شیش ناگ کی کینچلی پر نوکیلے ناخنوں کی ضربیں پڑنے لگیں تو شیش ناگ کے زہریلے پھنوں نے بادِ صرصر کا روپ دھار کر ان کے خوبصورت چمن پر حملہ کر دیا۔ بادِ صرصر کا زور اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ نہ صرف چمن کے رنگ برنگے پھول تباہ ہونے لگے بلکہ چمن کے پودے بھی جڑ سے اکھڑنے لگے۔ یہ خوفناک صورتِ حال دیکھ کر ان لوگوں کی ہمت ٹوٹنے لگی لیکن ان کے بزرگوں نے یہ کہہ کر ان کی ہمت بڑھائی کہ یہ بادِ صرصر برسوں سے ہمارے چمن زاروں کو برباد کرتی آئی ہے، اگر آج آپ

لوگوں نے اپنے سورج کو کالی جھیل کی دبیز تہوں کی غلامی سے آزاد نہیں کرایا تو ہمارا یہ چمن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بادِ صرصر کے نشانے پر رہے گا اور کسی بھی پھول کو بھرپور کھلنے کا موقع نہیں ملے گا۔

بزرگوں کی حوصلہ افزا نصیحت سن کر ان لوگوں کی ہمت اور بڑھ گئی اور وہ لگاتار جھیل کی دبیز تہوں کو پھاڑنے لگ گئے۔ جھیل کا کالا پانی جب ندیوں کی صورت میں سفر کرنے لگا تو شیش ناگ کو اپنا زہریلا وجود خطرے میں نظر آنے لگا۔ وہ ان لوگوں کی متحدہ سوچوں کو ڈسنے پر اتر آیا۔ اُس نے کئی جوانوں کو جھیل کی گہرائی میں ڈبو کر مار ڈالا لیکن وہ لوگ اپنے سورج کی آزادی کے لئے کوشش کرتے رہے۔ بزرگوں نے بہت سارے بچوں کو شیش ناگ کے زہریلے پھنوں کا شکار ہوتے دیکھا تو انھوں نے بین بجانی شروع کر دی۔ بین کی آواز ہر طرف گونجنے لگی اور شیش ناگ بین کی آواز پر مستی سے جھومنے لگا۔ شیش ناگ کو جھومتا دیکھ کر بزرگوں نے بہادر جوانوں کو حکم دیا کہ شیش ناگ کی کینچلی اکھیڑ دو۔ ان لوگوں نے شیش ناگ کی کینچلی اکھیڑنے کے ساتھ ساتھ اُس کے زہریلے دانتوں کو بھی توڑنا شروع کر دیا۔ جھیل کا کالا پانی آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا اور ان کا اپنا سورج آہستہ آہستہ جھیل کی قید سے آزاد ہو کر اوپر چڑھتا گیا۔ جھیل کو خشک ہوتے دیکھ کر شیش ناگ زخمی حالت میں وہاں سے فرار ہوا اور ان کے چمن میں بادِ صرصر کی بجائے بادِ صبا پھیلنے لگی۔ سورج کی کرنیں آزادی کے ساتھ ان کے چمن کے پھولوں کی پتیوں پر جمے ہوئے شبنمی قطروں کو چمکانے لگیں۔ بادِ صبا کی ٹھنڈی ہواؤں سے سارے پھول نکھرنے لگے اور سارا چمن خوشی سے جھومنے لگا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ چمن کے رنگ برنگے پھول اپنی نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں جس میں نہ کسی کالی جھیل کا فسانہ تھا اور نہ کسی شیش ناگ کا قصہ...!

○○○

کالے پیڑوں کا جنگل

سورج ڈوبتے ہی بستی کے اندر کالے پیڑوں کا جنگل نمودار ہو جاتا۔ ان کالے پیڑوں کی آدم خور شاخیں، آدم زاد کے قدموں کی آہٹ محسوس کرتے ہی آگ کے شعلے برسانا شروع کر دیتی تھیں اور جب اندھیری رات کا بھیانک سایہ بستی کے طول و عرض میں پھیل جاتا تو زندہ انسانوں کی چہکتی بستی شہر خموشاں کا نظارہ پیش کرتی تھی۔ خوف کے آسیب نے بستی کے پیر و جواں کے ذہنوں کو مفلوج بنا کے رکھ دیا تھا اور یہ لوگ طرح طرح کی نفسیاتی بیماریوں کے شکار ہو چکے تھے۔ کالے پیڑوں کی دہشت کی وجہ سے اندھیاری راتوں میں نہ کسی گھر میں روشنی چمکتی تھی اور نہ کوئی زبان اونچی آواز نکال سکتی تھی۔ لیکن! بچے... معصوم بچے... اس خوف و دہشت سے نا آشنا... جب کبھی ماں کی گود میں رونا شروع کرتے تو مائیں سر کے آنچل سے اُن کے منہ کو بند کر کے رکھتیں تاکہ باہر سے کوئی وحشیانہ دستک سنائی نہ دے۔ کوئی بھی انسان گھر سے باہر نکلنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا اور اگر کسی فرد کو مجبوراً گھر سے نکلنا پڑتا تو وہ آگ کے شعلوں کی نذر ہو جاتا۔ شب خون کا یہ سلسلہ اس بستی میں کئی دہائیوں سے جاری تھا۔

ایک منحوس رات جب تاجہ بیگم کے دودھ پیتے بچے کو اندھیرے میں بچھو نے ڈنک مارا تو وہ درد سے چیخنے لگا۔ بچے کو تڑپتا دیکھ کر رمضان چچا سخت پریشان ہو گئے۔ میاں بیوی نے اسپتال جانے کا مشورہ کیا۔ رمضان چچا لالٹین جلا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ وہ تاریکی میں روتے روتے اونچی آواز میں کالے پیڑوں سے فریاد کرنے لگا۔

''مجھے اسپتال جانے دو! میرا بچہ درد سے مر رہا ہے۔''

یہ سنتے ہی آگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور رمضان چچا کو اپنی لپیٹ میں لے کر بھسم کر ڈالا۔ تاجہ بیگم ابھی گھر سے باہر نہیں آئی تھی۔ اُن کے دوسرے بچے یہ اندوہ ناک منظر دیکھ کر نہ رو سکے اور نہ ہی تاجہ بیگم خاوند کی لاش کو دیکھ کر کچھ بول پائی۔ وہ رات بھر سسکیاں لیتی رہی اور پوہ پھٹنے کے انتظار میں تڑپتی رہی۔

صبح کے اُجالے میں جب بستی کے لوگ رمضان چچا کی لاش قبرستان میں دفن کرنے کے بعد واپس اپنے اپنے گھر کی طرف لوٹنے لگے تو ایک انجانی آواز نے ان قدم روک دئے۔

''عقل کے اندھو کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ کب تک خود کو دھوکہ دیتے رہو گے؟ اگر اسی طرح آنکھیں بند کر کے اپنی تقدیر کو کوستے رہو گے تو وہ کالے پیڑ تم سبھوں کو ایک ایک کر کے ختم کر ڈالیں گے۔ ذرا ہوش میں آ جاؤ' اپنی آنے والی نسل کے بارے میں سوچو!''

سب لوگوں نے جب مڑ کر دیکھا تو صدیوں پرانے بلند قامت چنار کے گھنے سائے میں ایک بارعب نورانی چہرے والے خدارسیدہ بزرگ کو باوقار اور پرسکون حالت میں پایا۔ تمام لوگ ان کے سامنے باادب کھڑے ہو گئے۔ بھیڑ میں سے ایک شخص نے جرأت کر کے بزرگ سے پوچھا۔

''حضرت! ہم لوگوں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

یہ سنتے ہی بزرگ غضبناک آواز میں بول پڑے۔

'' ارے نادانو! تمہاری آنکھوں پر غفلت کا پردہ پڑا ہے۔ میں تمہارا ماضی ہوں.. وہ شاندار ماضی، جس پر زمانے کو ہمیشہ ناز رہا۔ میں تمہاری تاریخ ہوں۔ وہ عظیم الشان تاریخ، جس کی مثال آج تک دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے۔''

بزرگ کے یہ پُر مغز الفاظ سُن کر تمام لوگوں کے سر شرم سے جھک گئے۔ لوگوں

نے جب بزرگ کو اپنی داستان الم سُنا کر اسے نجات حاصل کرنے کے لئے دُعا کی درخواست کی تو بزرگ نے جلال میں آکر انھیں پھٹکارا۔

''یہ مصیبت تمہاری جرمِ ضعیفی کی سزا ہے۔ یہ تمہارے بُرے اعمال کا بدلہ ہے۔ تم ان کالے پیڑوں کے رکھوالوں کے سر پر اپنے ہاتھوں سے حاکمیت کا تاج رکھتے ہو۔ اپنے اسلاف کے اصولوں کے برعکس ان دوست نما دشمن حاکموں کے اصولوں کی آبیاری کرتے ہو۔ دماغ تمہارا اور سوچ ان کی۔ تم لوگ اپنے ایمان سے آنکھیں چُرا کر، اپنے ضمیر کو کچل کر ان کے ہاتھوں پر بیعت کرتے ہو اور انھیں برسوں تک مسند اقتدار پر بٹھاتے ہو۔ اگر تمہیں ان کالے پیڑوں کے شعلوں سے خود کو بچانا ہے تو ان کی ہیبت سے نکل کر اپنی راکھ میں چنگاریاں تلاش کرو۔ کیونکہ یہی چنگاریاں دھکتے شعلے بن کر ان کالے پیڑوں کے جنگل کو راکھ کا ڈھیر بنا سکتی ہیں۔''

خزاں کا موسم تھا۔ بستی کے گردونواح کی پہاڑیوں کے اندر کا لاوا پھٹ پڑا اور سرد فضا، فضائے آتشین بن گئی۔ صدیوں پرانے چنار کے سُرخ مائل پتوں کو اپنے وجود کا احساس ہونے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پرسکون چنار، آتشِ چنار کا منظر پیش کرنے لگا اور کالے پیڑوں کا جنگل شعلوں کی بارش سے جل اٹھا۔

○○○

کالی دھند اور سفید کبوتر

(مزاحمتی افسانہ)

وہ اسپتال سے چیک اپ کروانے کے بعد گھر لوٹ رہا تھا۔ راجدھانی چوک کے قریب غیر متوقع ٹریفک جام سے آمدورفت کا سلسلہ درہم برہم ہو چکا تھا۔ گاڑیوں کے کالے دھوئیں کی زہر آلود فضا سے ماحول دھند زدہ ہو گیا تھا۔ افراتفری کے عالم میں لوگوں کا گاڑیوں سے اترنا چڑھنا جاری تھا۔ پُر انتشار کیفیت میں حساس طبیعت لوگوں نے دھندلے ماحول کی انفکشن سے احتیاط برتنے کے لئے منہ پر ماسک لگا رکھے تھے۔ نصف النہار کی شدید گرمی سے بس میں سوار سبھی مسافر پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ انہیں اپنا آپ دہکتے تندور میں تڑپتے ہوئے کبوتر کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے کھڑکی سے باہر کھڑے ایک پولیس والے سے دھیمی آواز میں پوچھا:

''بھائی صاحب! یہ جام کب ختم ہوگا؟''

پولیس والا نزدیک آکر اُس کے حُلیے کو گھورتے ہوئے بڑی ناگواری سے پوچھ بیٹھا: ''کیا کہہ رہا ہے؟''

پولیس والے کے تیور دیکھ کر وہ اپنی بات دہرانے سے ڈر سا گیا۔

''جناب ہم ٹریفک جام کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔'' پچھلی سیٹ سے سوامی جی کی آواز آئی۔

''اپنی پچپن برس کی زندگی میں میں نے اتنا سخت جام نہیں دیکھا ہے۔''

''ہاں جی ہاں۔'' بغل میں بیٹھے سردار جی نے خان صاحب کے کندھے پر ہاتھ

رکھتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے چھوٹے جام تو ہوتے دیکھے ہیں لیکن اتنا بھیا نک جام تو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔''

''وہ مسئلہ یہ ہے کہ راجدھانی کے تاریخی چوک میں پہلی بار ایک بڑا سیاسی جلسہ ہو رہا ہے۔'' پولیس والا اب نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے بول پڑا ''اس لئے صبح سے یہ جام لگا ہوا ہے۔''

''او وِیرا۔'' سردار جی تھوڑا سا جذباتی ہو کر بول پڑا۔ ''ان دیش کے غم خواروں کو اپنی ہمدردی کی نمائش کے لئے کوئی اور جگہ نہیں ملی تھی جو تاریخی چوک پر قبضہ جما کر لوگوں کو عذاب میں ڈال دیا۔''

پولیس والا ہاتھ میں ڈنڈا گھماتے ہوئے چپ چاپ اپنے قدم آگے بڑھانے لگا۔ وہ دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ دھند میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پھیلتی دھند میں لپٹے سرسبز درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھے کبوتروں کی سانسیں اُکھڑ رہی تھیں اور وہ بکھرتے گھونسلوں کو کوؤں کی یلغار سے بچانے کے لئے اپنے پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ کبوتروں کی بدحواسی دیکھ کر وہ سرد آہ بھرتے ہوئے سوچنے لگا کہ دہائیوں سے ان کبوتروں کی روح زخمی ہو رہی ہے، کب انہیں کوؤں کی یورش سے نجات ملے گی۔

''میرے دیش واسیو!'' خواب گر سیاست دان کی گرج دار آواز جلسہ گاہ سے بلند ہوئی۔ ''امن کی مٹھاس.. دیش کا اتہاس.. اتہاس کے لئے نہ صرف سب کی برابری ضروری ہے بلکہ جنتا کے ساتھ ساتھ جانوروں کو بھی تحفظ دینا لازمی ہے، کیونکہ عدم تشدد ہماری پرمپرا ہے۔''

عدم تشدد کا نام سنتے ہی اُس کے کٹے بازو سے ایک برقی رو سی دوڑ کر سیدھے دل سے جا ٹکرائی۔ دل سے درد کی ٹیس نے دماغ میں ہلچل مچا دی۔

''سب باہر نکلو'' باہر سے دہشت ناک آواز آئی۔ ''دروازہ کھولتے ہو کہ گھر کے ساتھ زندہ جلا دئے جاؤ گے۔''

دہشت ناک آواز سے سبھی لوگ نیند سے جاگ اُٹھے اور خوف زدہ ہو کر محسن خان کے کمرے میں جا کر سہم گئے۔ دہشت بھری آواز سے ان کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ محسن خان کا نوجوان بیٹا احسان خان دروازہ کھولنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا لیکن باپ اور دوسرے گھر والوں نے اسے روک لیا۔ سبھی لوگ سہم کر یہ سوچنے سے قاصر نظر آ رہے تھے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ خوف کی ہوائیں ابھی صحن میں ہی سائیں سائیں کر رہی تھیں کہ اچانک دہشت کے ناگ گھر کے اندر بھی گھس کر رینگنے لگے۔ ڈر کے مارے عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ خوف کا پھندا احسان خان کی گردن پر پڑتے ہی وحشت ناک آواز کمرے میں گونج اٹھی:

''اپنے تہوار پر حقوق حیوان کا خون کر کے ہمارے آدرشوں کا بھی خون کرتے ہو۔''

یہ سن کر احسان خان کا بزرگ باپ روتے بلکتے دہشت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے بول پڑا:

''ہم پر رحم کھاؤ، ہم نے تہوار میں کسی کے آدرشوں کا خون نہیں کیا ہے۔''

آدرش کا زہریلا ترشول برق رفتاری سے بزرگ محسن خان کے پیٹ میں گھس گیا اور پھول کو چمن سے جدا کر دیا۔ احسان خان یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر جونہی دہشت کے نرغے کو پھاند کر باپ کی پیٹ سے ترشول نکالنے لگا تو حقوق حیوان کی علمبردار تلوار نے انسانی ہاتھ کو بڑی بے رحمی سے کاٹ ڈالا اور ایک معصوم بیٹا بے ہوش ہو کر مظلوم والد کی لاش پر گر پڑا۔ دہشت کی آواز مخصوص اتہاس کے نعرے لگاتے ہوئی اندھیرے میں گُم ہو گئی۔

''تو بولو، امن کی مٹھاس.. دیش کا اتہاس...'' جلسہ گاہ سے لاوڈ اسپیکر سے نعرے بلند ہوئے۔

''سب بکواس۔'' سردار جی طیش میں آ کر بول پڑا۔ ''ہاتھی کے دانت دکھانے

کے اور کھانے کے اور۔''

ہاتھی کے دانت.. بن کر اس نے بند آنکھیں کھولیں اور سردار جی کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ جلسہ ختم ہوتے ہی گاڑیاں آہستہ آہستہ رفتار پکڑنے لگیں۔ اپنی منزل پر پہنچ کر وہ گاڑی سے اتر کر گھر کی جانب بڑھ گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی بیوی پوچھ بیٹھی کہ اتنی دیر کیوں لگادی، فون بھی نہیں ہو رہا تھا۔ سب ٹھیک تھا نا؟

ہاں وہ ٹریفک جام کی وجہ سے دیر ہوگئی۔ اب جلدی بستر بچھاؤ میں تھک گیا ہوں اور چائے بھی اُدھر ہی لانا۔ بیڈ پر لیٹ کر اُس نے ٹی وی آن کیا۔ نیشنل چینل پر نیوز چل رہی تھی۔ نیوز کے دوران الیکشن ایڈ آیا:

''کل وقت پر الیکشن بوتھ پر پہنچ کر ایک ذمہ دار شہری ہونے کا ثبوت دیں اور اپنے قیمتی ووٹ کا صحیح استعمال کر کے دیش کے وکاس میں اپنا حصہ ادا کریں۔''

ایڈ ختم ہوتے ہی اُس نے ٹی وی آف کر دیا اور سوچنے لگا کہ کیا ووٹ کا صحیح استعمال کرنے سے ہمیں دہشت سے نجات ملے گی..؟ کیا ہمارے احساسات کی گاڑی ٹریفک جام سے نکل پائے گئی..؟ کیا کوؤں کی یلغار سے کبوتروں کے آشیانے بچ پائیں گے..کیا راجدھانی چوک کی فضاؤں میں پھر سے امن کی خوشبو پھیلے گی..؟ کیا ہم عدم تحفظ کی سائیکی سے نجات پا سکیں گے..؟

اس طرح کے کئی روح فرسا سوالات اس کے ذہن میں آتے رہے اور وہ کبھی ہاں اور کبھی نا جیسی عجیب کشمکش میں پھنس کر سو گیا۔ صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد سبھی گھر والے پولنگ بوتھ کی جانب نکل پڑے۔ ماحول پر عجیب قسم کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ راہ چلتے چلتے کئی جگہوں پر دہشت کے ترشول نظر آتے رہے۔ ایک جگہ تو ان کے کانوں سے مخصوص اتہاس کا ساتھ دینے کی آواز بھی ٹکرائی لیکن وہ سر جھکائے ہوئے پولنگ بوتھ کے باہر لگی قطار میں پہنچ گئے۔ یہاں پر ماحول قدرے خوشگوار ہی تھا۔ ووٹ ڈالنے کا کام ٹھیک طرح سے چل رہا تھا۔ وہ اپنی باری پر جب پولنگ بوتھ میں داخل ہوا تو پولنگ

آفیسر اس سے نام پوچھ بیٹھا:

''سر... میرا نام احسان خان ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔''پولنگ آفیسر رجسٹر پر ٹک لگاتے ہوئے بول پڑا۔

''جاؤ ادھر پردے کے پیچھے آرام سے اپنا ووٹ ڈالو۔''

جی شکریہ کہتے ہوئے وہ ای۔وی۔ مشین کے قریب پہنچ گیا۔ مشین پر لگے نشان کو دیکھتے ہی اس کی نظر کوّے اور سفید کبوتر کے نشان پر ٹک گئی۔ اسے کوّے کی چونچ ترشول محسوس ہوا جو دھند میں پھنسے کبوتر پر حملہ کرنے کے لئے گھات لگائے بیٹھا ہے۔ ترشول کی سائیکی سے دماغ میں خوف کے دھماکے ہونے لگے لیکن دل کے سکون نے دماغ کے خوف پر قابو پالیا۔ کبوتر والے بٹن پر انگلی پڑتے ہی اُسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے سفید کبوتر کالی دھند سے آزاد ہو کر فضائے بسیط میں لمبی اڑان بھر رہا ہے۔

○○○

عید مُبارک

''اتحاد میں طاقت ہے۔''

وہ زندگی میں پہلی بار فلسفۂ اتحاد کی معنی خیز کہاوت کے عملی مشاہدے سے اتنا متاثر ہوا کہ احساس کی ابھرتی ڈوبتی لہریں دل ودماغ میں دیر تک فکری ارتعاش پیدا کرتی رہیں۔ مشاہدہ ہی ایسا حیرت انگیز تھا کہ زندگی بھر کے فلسفۂ اتحاد سے متعلق سنی سنائی منبر ومحراب اور سیاسی گلیاروں کی شعلہ بار تقریریں راکھ کا ڈھیر محسوس ہوئیں' کیونکہ ہر تقریر اتحاد اتحاد کے راگ سے شروع ہو کر بکھراؤ کے زیر وبم کی شکار ہو جاتی ... وجہ.. اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ۔

وہ جب نیند سے بیدار ہوا تو اس کی طبیعت ایک خوش گوار احساس سے سرشار ہوئی کیونکہ وہ دن نہ صرف اس کے لئے بلکہ پوری قوم کے لئے خوشی کا دن ہوتا ہے بلکہ یوں کہیں کہ یہ تہوار ہی ایثار وقربانی کے عملی پیام کا تہوار ہے۔ اسی مہینے میں سنت ابراہیمی کے پیش نظر حج وقربانی کے احکامات پر عمل کیا جاتا ہے اور عالمی سطح پر عید کی خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ اس نے بھی جب نہا دھو کر سفید لباس زیب تن کر کے خوشبو سے خود کو آراستہ کیا اور عید گاہ کی جانب چلنے کی تیاری کرنے لگا تو اس کے دو معصوم بچے کھلکھلاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور عیدی عیدی کہتے ہوئے کمرے میں جھومنے لگے۔ وہ تھوڑی دیر تک دونوں کی اچھل کود سے لطف اندوز ہوتا رہا اور پھر دونوں کو عیدی دیکر تکبیر تشریق کا ورد کرتے ہوئے عید گاہ کی جانب نکل پڑا۔ ہر طرف خوشی کا ماحول تھا۔ کہیں پر

بچے کھیل کود میں مست تھے اور کہیں سے بانسری بجانے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔لوگ ایک دوسرے کو گلے لگاتے ہوئے عید کی مبارکباد دینے میں مصروف تھے۔وہ بھی عید مبارک کی رسم نبھاتے ہوئے عیدگاہ میں جا پہنچا۔عیدگاہ میں خوشگوار سماں بندھا ہوا تھا۔بیشتر لوگ سفید لباس میں ملبوس نظر آرہے تھے۔ہر طرف تکبیر تشریق کا ورد ہو رہا تھا اور مولوی صاحب کے خطاب کے ساتھ ہی سب لوگ خاموش ہو گئے۔مولوی صاحب نے نفس موضوع کے پیش نظر قرآن شریف کی چند آیات تلاوت کیں اور پھر بڑے دلنشیں انداز سے عید کے مسائل وفضائل اور اہمیت پر روشنی ڈالنے لگے۔دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ وہ بھی بڑے سکون سے وعظ ونصیحت سے محظوظ ہو رہا تھا۔خطاب کے دوران جونہی مولوی صاحب نے نارِ نمرود اور خانۂ کعبہ کی تعمیر کے تعلق سے حضرت ابراہیمؑ کے صبر واستقامت اور پیامِ توحید کا ملت اسلامیہ کی موجودہ المناک صورت حال سے موازنہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''یہ حضرت ابراہیمؑ کے ایمانی قوت کا عملی ثبوت تھا کہ سپر پاور نمرود کی خدائی کا چیلنج کرنے کے باوجود نمرودی آگ کے شعلے انہیں پیامِ توحید کا اظہار کرنے سے نہ روک سکے اور انہوں نے بیت اللہ کی تعمیر کر کے یہ پیغام سنایا کہ مسلمان صرف خدا کا بندہ ہوتا ہے نہ کہ کسی نمرود یا فرعون کا غلام، اس لئے ہمیں اتحاد کا مظاہرہ کر کے دشمنوں کے خلاف متحد ہو کر کھڑا ہونا چاہیے۔''

اتحاد کا نام سنتے ہی اس کے بدن میں آگ سی لگ گئی۔وہ سوچنے لگا کہ ہم لوگ ہر وقت صرف لفظوں کے تیر چلاتے چلاتے جذبات کے بم ہی پھوڑتے رہتے ہیں اور آخر پر اتحاد اتحاد کا رونا روتے روتے پھر انتشار کی کھائیوں میں گر جاتے ہیں۔ہم لوگوں نے اسلام کے نام پر کئی اسلام بنائے رکھے ہیں۔کہیں پر مسلک پرستی کا اسلام نظر آرہا ہے اور کہیں پر عربی عجمی کی رسہ کشی پھیلی ہوئی ہے لیکن جب دورِ جدید کے نمرود فرعون متحد ہو کر آسمان سے آگ کے شعلے برساتے ہیں تو وہ شعلے بلاتفریق عربی عجمی ہر کسی کو ایک

ساتھ ختم کر جاتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک سارے مسلمانوں کا وجود ایک جیسا ہے۔

مولوی صاحب کا خطاب جاری تھا۔ اس نے عید گاہ میں موجود مجمع پر نظر ڈالی۔ ہر کوئی غنودگی کی سی حالت میں دکھائی دے رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ لفظوں کے تیر کھا کھا کر شاید مسلمانوں کا دماغ اتنا زخمی ہو چکا ہے کہ وہ عید کے روز سفید لباس میں زندہ لاشیں دکھائی دے رہے ہیں۔

مولوی صاحب کی شعلہ بیانی جاری تھی۔ وہ مسلمانوں کی بربادی کا ذمہ دار غیر مسلموں کو ٹھہراتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ یہ لوگ متحد ہو کر مسلمانوں کو عراق و افغانستان، مصر و شام، کشمیر و برما میں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر رہے ہیں۔ شعلہ بیانی سے پھر اندرونی اضطراب کی آگ سلگ اٹھی اور اس کے سامنے سرزمینِ توحید کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ گیا کہ کس طرح کعبہ شریف کے کلید بردار آج آزر کے روپ میں نئے نئے لات و منات کے قدموں میں سر جھکا کر اقتدار کی بھیک مانگتے ہیں اور اگر کوئی مرد حر الملک للہ والحکم للہ کی تکبیر بلند کرتا ہے تو یہی کلید بردار نمرودی آگ بن کر خود اسے بھسم کر دیتے ہیں۔ صرف دھوکہ ہی دھوکہ۔

وہ ابھی ان ہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ نماز کے لئے صف بندی ہو گئی۔ نماز ادا کرنے کے بعد وہ دوست احباب کے ساتھ علیک سلیک کرنے لگا اور پھر گھر کی جانب چل پڑا۔ لیکن راہ چلتے چلتے وہ یہی سوچتا رہا کہ ہم لوگوں نے پیامِ عید کا مطلب صرف عید مبارک تک ہی محدود رکھا ہے۔ فلسفۂ عید کے سمجھنے سے عاری اس قوم کا دماغ شاید سو چکا ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ عمر بھر وہ قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں پڑھتا اور پڑھاتا رہا۔ تواریخ عالم کے مطالعہ سے وہ یہ راز جان چکا تھا کہ:

"جب کسی قوم کا دماغ سو جاتا ہے تو اس کی زندگی کی رات شروع ہو جاتی ہے، چاہئے وہ کتنی ہی رسومات و عبادات کا اہتمام ہی کیوں نہ کرتی ہو، لیکن اس کے مستقبل کی لگام بیدار ذہن قوموں کے ہاتھوں میں آ ہی جاتی ہے اور وہ جس طرح سے چاہے،

ان کے وجود کو تماشا بنا سکتی ہے۔''

گھر پہنچ کر وہ نجی کتب خانے میں جا بیٹھا اور لیپ ٹاپ پر آن لائن نیوز پڑھنے لگا۔ کئی اخبارات میں مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کا جائزہ پیش ہوا تھا۔ کئی مضامین کا مطالعہ کرتے کرتے اسے رات کا خواب یاد آیا۔ وہ کسی وادی کے ایک سرسبز وشاداب چمنستان میں موجود ہے۔ چمنستان میں ایک بڑا تالاب بھی ہے جس میں بہت سارے ہنس پُرسکون ماحول میں قطار در قطار تیر رہے ہیں۔ اسے یہ نظارہ خوش کن لگا۔ وہ ابھی اس خوش کن نظارے سے لطف اندوز ہی ہو رہا تھا کہ اچانک کرگسوں کی پرواز شروع ہوگئی۔ چند کرگس تالاب کے کنارے پر اتر آئے اور ہنسوں کو اپنی طرف بلانے لگے۔ کئی ہنس تو کرگسوں کے بلانے پر حاضر ہوئے لیکن کئی الگ الگ سمتوں کی جانب چلے گئے۔ کرگس انہیں جو کچھ سمجھا رہے تھے وہ گردن جھکا کر وفاداری کا اعتراف کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ جب دوبارہ تالاب کے درمیان پہنچے تو آہستہ آہستہ ہنسوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے تالاب کا نیلا پانی سرخ مائل ہوتا چلا گیا اور گرسوں کی فتح آفریں پرواز شروع ہوگئی۔ وہ یہ تباہی دیکھ کر ہنسوں کی بیوقوفی پر افسوس کرنے لگا۔

وہ ابھی خواب کے منظر میں ہی کھویا ہوا تھا کہ کھڑکی سے باہر کوؤں کی کائیں کائیں کا زوردار شور سنائی دیا۔ شور سن کر اس نے کھڑکی کھولی اور باہر کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں اخروٹ کے پیڑ پر کوؤں کا ایک غول نظر آیا۔ کوؤں نے شور سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ شور سن کر دوسرے کوّے بھی غول میں شامل ہو رہے تھے۔ وہ یہ نظارہ دیکھ کر سوچنے لگا کہ آج تک تو یہاں پر کبھی بھی کوؤں کا اتنا بڑا غول کائیں کائیں کرتا نظر نہیں آیا' آخر مسئلہ کیا ہے؟ وہ بغور کوؤں کے غول کا مشاہدہ کرنے لگا۔ چند کوّے کائیں کائیں کرتے کرتے زمین کی طرف اتر آئے اور چند دوسرے بھی ان کے پیچھے دائرے کی صورت میں شور مچاتے ہوئے پرواز کرنے لگے۔ یہ ہنگامہ خیز ماحول دیکھتے ہی اس کی نظر ایک کتے پر پڑی۔ کتے نے ایک کوّے کو پنجوں تلے دبائے رکھا تھا۔ کوّا زخمی حالت

میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں سب ماجرہ آ گیا۔ کتا کوؤں کا شور سن کر تھوڑا سا پریشان ہوا اور جب چند کوؤں نے اس پر زوردار حملہ کر کے اپنی چونچ سے وار کرنا بھی شروع کر دیئے تو طاقت ور کتا کمزور پرندوں کے احتجاج اور حملے کی تاب نہ لا کر اپنے شکار کو چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ حیران کن صورتحال دیکھ اسے کوؤں کے اتحاد اور احتجاج کا کامیاب تجربہ سمجھ میں آیا۔

زندگی میں پہلی بار اتحاد و احتجاج کا یہ مثالی مشاہدہ دیکھ کر وہ حیرت زدہ ہو کر سوچنے لگا کہ طاقت ور کتے کے مقابلے میں کمزور کوّے مثالی اتحاد کا مظاہرہ کر کے اپنے ہم جنس کو بچانے میں کامیاب رہے، ویسے بھی کوّے تو بڑے محسن ہیں کیونکہ انہوں نے ہابیل اور قابیل کے زمانے سے ہی انسانوں کی رہنمائی کی ہے۔ اس نے پھر کوؤں کے غول کی طرف دیکھا جو زخمی کوّے کے ارد گرد چکر لگاتے لگاتے جیسے طنز کر رہے تھے کہ:

"عید مبارک کے تہوار پر مسلمان کم از کم ہم کوؤں سے ہی اتحاد کا سبق سیکھ لیتے۔"

○○○

تاج محل اور گئوشالہ

(مزاحمتی افسانہ)

چہار جانب خوف کی ہوائیں سائیں سائیں کرتی تھیں۔گلستان کے پھول دھویں کی لپیٹ میں آچکے تھے اور چہچہاتے پرندے بھی کالے دیوؤں کی ہاہا کار سے سہمے ہوئے تھے۔کالے دیو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے کیونکہ انہیں بوڑھے ناگ سے آدیش ملا تھا کہ اب گلستان کے باسیوں کی سفید ٹوپی کا فیصلہ سنانے کا وقت آیا ہے۔وہ اس جابرانہ فیصلے سے آگ بگولہ ہو جائیں گے‘اس لئے پہلے ہی سارے گلستان کو خوف کے دھویں سے بھر دو تا کہ وہ کھانسنے کے سوا کچھ نہ کر سکیں۔خوف کی ہوائیں تیز ہونے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے گلستان کے مخصوص چمن زار دھویں کی لپیٹ میں آ گئے۔مظلوم باسی بے بسی کے بت بن گئے کیونکہ ان کے پاس ایسا کوئی طاقت ور منتر نہیں تھا کہ کالے دیوؤں پر پھونک مارتے تا کہ ان کا نشہ چور ہو جاتا۔دھواں اتنا زہریلا تھا کہ کھانس کھانس کر جب بے بس و مظلوم باسیوں کا دم گھٹنے لگا اور جسم نڈھال ہو گئے تو ہمدرد آنکھیں درد انگیز آنسو بہانے پر مجبور ہو گئیں۔شاہین باغ کے شاہین بھی کوؤں کی یورش میں پھنس گئے۔

وہ سوچ، دیکھ رہا تھا...

”سفید ٹوپی کی چمک نہ صرف بوڑھے ناگ بلکہ کالے ناگوں کے لئے بھی سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ان کی آنکھیں جب سفید ٹوپی کی چمک سے چندھیا جاتیں تو انہیں اپنا سرخ ٹیکا غلامی کا داغ محسوس ہوتا۔انہیں ایسا لگتا کہ جیسے گلستان کے مالک ہونے کے باوجود وہ آج بھی سر اٹھا کر چل نہیں سکتے اور جب تک سفید ٹوپی چمکتی رہے گی‘

اس وقت تک سرخ ٹیکے کا رنگ ماند ہی نظر آئے گا۔''

اور یہ سب دیکھنے کے بعد وہ سوچ رہا تھا...

''اصل میں یہ ان کا نفسیاتی وہم ہے۔ نہیں تو وہ خود بھی جانتے ہیں کہ سفید ٹوپی کی اب صرف چمک موجود ہے' باقی سب رنگ سرخ ٹیکے میں رنگ گئے ہیں' یہاں تک کہ انسانوں کے ساتھ ساتھ حیوان بھی سرخ ٹیکے کی مالا ہی جپتے ہیں۔''

اور حیوان کیوں نہ مالا جپتے' وہ تو یہ دیکھ کر فخر محسوس کرتے تھے کہ وہ بھی اب حیوان ہونے کے باوجود انسانوں کی صف میں کھڑے ہیں' کیونکہ ان کے نام پر اب تو ایک انسان دوسرے انسان کا قتل کر کے خود حیوان بنتا جا رہا ہے۔ انسانوں کا یہ گھٹیا پن دیکھ کر حیوان خوش ہو کر اپنے حیوان ہونے پر ناز کرتے کہ اگر کہیں وہ بھی انسان ہوتے تو پتہ نہیں انہیں بھی اپنی انانیت برقرار رکھنے کے لئے کتنا گرنا پڑتا۔ ایسے بیہودہ کام کرنے والوں کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے حیوان ان لوگوں کو گدھوں سے بھی بدتر سمجھتے کہ سوچ نہ سمجھ صرف ڈینگیں مارنے کو اپنی بہادری سمجھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ گدھا کتنی ہی ڈینگیں مار کر خود کو عقل مند سمجھنے کی کوشش کیوں نہ کرے' لیکن پھر بھی وہ گھوڑا نہیں بن سکتا۔

ایک دن بوڑھے ناگ کی طرف سے گلستان کے لئے نیا منشور سامنے آیا کہ اب قانونی طور پر حیوانوں کو انسانوں کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ سننا تھا کہ گائے کی گردن پھولوں کی مالا سے سجنے لگی اور گئو شالے جدید دور کی میڈیکل لیباٹریز بن گئے۔ اب مسئلہ یہیں تک نہیں رہا بلکہ جب گائے کی محبت میں نفرت کے جراثیم سرایت کر گئے تو دھیرے دھیرے سفید ٹوپی کو دیکھتے ہی اُس کے نوکیلے سینگوں سے خون کے پھوارے چھوٹنے لگے۔ خون آلود سینگوں کی دہشت اس قدر پھیل گئی کہ انسان تو انسان حیوان بھی گائے کے گن گانے پر مجبور ہو گئے۔ انہیں اب گائے کوئی مقدس مخلوق محسوس ہونے لگی اور گئو شالہ جدید دور کا لال قلعہ۔ اب گائے عام حیوان نہیں بلکہ 'گاوِ سامری' کا درجہ پا گئی اور کالے ناگ گئو شالہ کے سنگھاسن پر براجمان گائے کے اردگرد پھن مارے بیٹھے

رہتے۔گلستان کا یہ نیا دیو مالائی ماحول دیکھ کر جدید دور کے پرندے قدیم دور کی جہالت کو یاد کرتے ہوئے ٹھونگیں مار مار کر ہنسی مذاق کے نقارے بجاتے رہتے۔

گلستان کے سرسبز و شاداب چمنستانوں میں کالا دھواں پھیلتا ہی جا رہا تھا۔لیکن عجیب بات یہ تھی کہ کالے ناگ ڈینگیں مار مار کر دھویں کو روشنی بنا کر پیش کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہتے اور فخر سے اتنا جھوٹ بولتے کہ سچ بھی شرم سے اپنا سر چھپائے بیٹھنے پر مجبور ہو جاتا۔بندر نما میڈیا تو جھوٹ کو سچ بنانے کی ڈفلی زور زور سے بجاتا رہتا۔اب جو روشنی پسند لوگ ان ڈینگیں مارنے والے جھوٹے کرتب بازوں کا بھانڈا پھوڑنے کی کوشش کرتے تو ان کی آواز یا تو صدا بہ صحرا ثابت ہو جاتی یا ان کی سانسیں کالے دھویں کی زد پر رہتیں۔اس ہیبت ناک صورتحال میں اس کی انکھوں کے سامنے ماضی کا نقشہ گھومنے لگا...

گلستان میں سفید ٹوپی اور سرخ ٹیکے کی یہ تاریخی رسہ کشی کئی موسموں سے جاری تھی۔دراصل سرخ ٹیکے کے حواری یہ سمجھتے تھے کہ یہ سفید ٹوپی والے گلستان میں زبردستی گھس آئے ہیں، نہیں تو گلستان کے اصلی مالی ہم ہیں اور انہوں نے صدیوں تک گلستان کے موسموں کو اپنی سانسوں کے ماتحت رکھا اور سرخ ٹیکے کا رنگ ماند کرتے رہے۔اصل میں وہ حقیقت سے منہ موڑ لیتے تھے۔کیونکہ انہی سفید ٹوپی والوں کے روشن دور میں یہ گلستان وجود میں آیا تھا نہیں تو یہ مختلف چمنستانوں میں بٹا ہوا تھا۔ان کی سانسوں کی بدولت یہ گلستان سونے کی چڑیا بن گیا تھا اور جب گورے گدھ گلستان کے چمنستانوں پر ٹوٹ پڑے تھے تو گلستان کی آن بچانے کے لئے سفید ٹوپی والے ہی شہید ہو کر 'شیر' کا خطاب پانے میں کامیاب ہوئے تھے۔باقی لوگ لومڑیوں کی طرح مکاری کی کھال پہن کر گورے گدھوں کا جھوٹا چاٹنے پر پھولے نہیں سماتے تھے۔

ماضی کی یادوں سے نکل کر وہ دوبارہ حال پر غور کرنے لگا...

اب تو حال یہ ہے کہ سفید ٹوپی والوں کو گھس پیٹھیے کی گالی دے کر انہیں کبھی

گھر واپسی کے خوف سے ڈرایا دھمکایا جاتا ہے اور کبھی حیوانوں کا غم خوار جتلا کر انسانیت کی دھجیاں اڑائی جارہی ہیں۔ دراصل یہ عقل کے اندھے روشنی سے آنکھیں چرا کر گلستان کو صدیوں پرانے اندھیرے کی طرف واپس دھکیلنے پر تُلے ہوئے ہیں۔

گلستان کی فضا میں تناؤ کے بادل رقصاں تھے۔ بادلوں کا یہ پُرتناؤ رقص کئی موسموں سے جاری تھا۔ کالے دھویں میں کیسری رنگ تحلیل ہوتا جارہا تھا، جس سے بہت سارے لوگ دھوکہ کھا جاتے کہ شاید بعد میں دھواں ختم ہوجائے گا اور زعفران کی خوشبو پوری فضا میں پھیل جائے گی۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے کہ اس دھویں کے پیچھے جو آگ سلگ رہی ہے وہ پورے گلستان کو برباد کرسکتی ہے۔ کیونکہ یہ دھواں کسی کامیابی کی علامت نہیں بلکہ یہ چند خودغرض لوگوں کی انانیت کی دھند ہے جو اپنی انا کی آگ بجھانے کے لئے پورے گلستان کو آگ کے شعلوں میں جھونک رہے ہیں۔

ایک دن جنگل کے قانون میں بوڑھے ناگ نے طاقت کے بل پر یہ سیاہ فیصلہ سنایا کہ گلستان کے ایک چمن سے سفید ٹوپی کی چمک ختم کی جاتی ہے تاکہ وادیٔ زعفران کے فطری رنگ کو اپنے مصنوعی رنگ میں رنگا جاسکے۔ یہ اندھا فیصلہ سن کر کالے ناگ خوشی سے اچھل پڑے۔ لیکن گلستان کی روشنی پسند آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا کیونکہ انہیں محسوس ہوا کہ یہ اس روشن زمانے کا کالا فیصلہ ہے اور یہ کالا فیصلہ پورے گلستان کو اندھیرے میں ڈبوئے گا۔

جنگل کے قانون میں جابرانہ فیصلہ سنانے سے پہلے وادیٔ زعفران کے ہر پھول کے اوپر کالے دیوؤں کے سائے منڈلانے لگے اور وادی کے بے بس مکینوں کی مظلوم سانسوں کو کالے سایوں کے پھندوں سے کس کر رکھ دیا گیا۔ جہالت اور چنگیزیت کا یہ خوف ناک ناچ دیکھ کر انصاف گھروں کی گھنٹیاں بھی گونگی پڑ گئیں اور جمہوریت کو بھی اپنا جسم سلگتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ کالے دیو وادیٔ زعفران کی سانسوں میں کالا دھواں تحلیل کرتے جاتے اور بے بس لوگ کھانس کر بے حال ہوتے رہے۔ ظلم و جبر کی یہ

تلوار فضا میں عرصۂ دراز تک گشت کرتی رہی اور سرخ ٹیکے کا رنگ خوشی سے چمکتا رہا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ جنگل کے قانون میں سفید ٹوپی کی چمک کا اغوا کر کے اب شاید سرخ ٹیکے کی چمک رہے گی اور وادیٔ زعفران بھی کیسری رنگ میں رنگی جائے گی۔۔لیکن ایک رات جب ایک سفید ٹوپی والا گھر سے باہر نکل آیا تو اسے دیکھتے ہی کالے دیوؤں کی انکھوں میں سرخی پھیل گئیں۔

''اتنے دنوں کے بعد گھر سے باہر نکلنے کی ہمت کیسے ہوئی۔'' ایک خوفناک آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''میرا بچہ بیمار ہے۔'' اس کا دل اگر چہ خوفناک آواز سے ڈوبنے لگا تاہم روہانسی آواز میں بول پڑا۔

''وہ دھویں سے بیمار ہوا ہے' اسے اسپتال لے جانے کی اجازت دے دو۔''

''اچھا۔'' ایک کالا دیو ہنس کر بولا اور پھر دُھتکارنے لگا۔'' دفع ہوجا۔۔گھر کے اندر چُھپ کر بیٹھ۔''

''لیکن' وہ کئی دنوں سے بیمار ہے۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کرنے لگا۔'' اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔اوپر سے گھر میں کچھ کھانے کے لئے بھی نہیں بچا ہے۔''

''کہانا' گھر میں بیٹھ جا۔'' کالا دیو دھمکاتے ہوئے بولا۔'' اور ابھی تک یہ سفید ٹوپی سر پر رکھی ہے۔''

''کیوں نہ رکھوں۔'' وہ تیور بدل کر بولا۔''تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہارے دھویں کا خوف ہماری شناخت بھی چھین لے گا۔''

''تمہاری شناخت۔۔ہاہاہا۔۔'' کالا دیو طنز کرنے لگا۔''یہاں تو سب لوگ خوش ہیں اور تم اپنی شناخت کا راگ الاپتے ہو۔کس دنیا میں رہتے ہو۔''

''اچھا' یہاں سب خوش ہیں۔'' وہ غصے سے لال پیلا ہوکر کہہ اٹھا۔''ذرا کالے دھویں کا خوف کم ہونے دو۔پھر دیکھو گے کہ لوگ تمہارے جنگل راج سے کتنے خوش ہیں۔''

یہ سننا تھا کہ کالے دیو آپے سے باہر ہو گئے اور ستّر سالہ سفید ٹوپی والے بزرگ کی کھانسی رفتہ رفتہ کالے دھوئیں میں تحلیل ہو گئی۔

وقت نے کروٹ بدلی...

ایک دن جب گائے کے سامنے ایک معصوم سفید ٹوپی والے کو کالے ناگوں نے ڈس ڈس کر مار ڈالا تو گائے کی آنکھیں بھی آبدیدہ ہو گئیں۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کے سامنے اُس کے بچھڑے کو جنگلی کتوں نے کاٹ کھایا۔ گائے سوچنے لگی کہ جن انسانوں کو وہ ماں کی طرح دودھ پلاتی تھی اور جو اسے پیار سے کھلاتے پلاتے تھے۔ اب انہیں کے خون سے اس کے سینگ رنگے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنی نسل میں بھی شرم سے پانی پانی ہو رہی ہے تو اس کے اندر مادرانہ شفقت جاگ اٹھی۔ وہ سنگھاسن سے کود پڑی اور سینگ مار مار کر اسے توڑنے لگی۔

وادیٔ زعفران میں پھیلے ہوئے دھوئیں کے درمیان آگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے شعلوں نے کالے دیوؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آگ کے شعلوں کی تباہی سے نہ تو کالے دیوؤں کے سرخ ٹیکے کی چمک بچ سکی اور نہ ہی کالے ناگوں کو اپنے کیسری تاج کا کچھ پتہ چلا کہ وہ کب آگ کے شعلوں سے کوئلہ بن گیا۔

وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا...

نہ صرف وادیٔ زعفران میں سفید ٹوپی کی چمک پھیل چکی تھی بلکہ سارا گلستان کالے دھوئیں کی گھٹن سے بھی آزاد ہو چکا تھا۔ سرخ ٹیکے کی چمک ماند پڑی تھی۔ کالے ناگ پھنکارنے کے بجائے سنگھاسن کی ویرانی دیکھ کر کف افسوس مل رہے تھے اور جُگت باز بوڑھا ناگ اپنے ہی پھیلائے ہوئے دھوئیں میں کھانس کھانس کر تاریخ کے اٹل فیصلے سے لرز رہا تھا کہ:

''تاج محل جیسا شاہکار صرف شاہ جہاں ہی بنا سکتا ہے اور تاج محل کے مقابلے میں گئوشالہ بنانا... کوّے کے سر کو مور کے تاج سے سجانے جیسا عمل ہے۔''

○○○

جنت کی چابی

(مزاحمتی افسانہ)

امن کتابوں کا بستہ کندھے پر ڈال کر اسکول کی جانب نکل پڑا۔ وہ بس اسٹاپ پر پہنچا اور دوسرے ہم مکتب ساتھیوں کی ٹولی میں شامل ہو کر بس کا انتظار کرنے لگا۔ انتظار کے دوران بچے آپس میں ٹھٹھے بازی کرنے میں مشغول تھے۔ بس اسٹاپ پر دوسرے لوگ بھی موجود تھے جن میں سرکاری ملازمین، دکاندار، مزدور اور دینی مدارس کے طالب علم وغیرہ بھی شامل تھے۔ بس اسٹاپ پر تو سبھی لوگ انتظار کرتے تھے لیکن عام طور پر دینی مدارس میں زیر تعلیم بچے اور فوجی اسکول کے بچوں کی ٹولیاں الگ الگ دکھائی دیتی تھیں۔ چونکہ امن کا والد بھی ایک فوجی افسر تھا اس لئے امن اور اس کا چھوٹا بھائی بھی شہر کے آرمی اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ بس اسٹاپ پر دونوں ٹولیوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ قائم رہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دوسرے بچوں کے بدلے آرمی اسکول کے بچے اسکول کی مخصوص گاڑی میں ہی اسکول جایا کرتے تھے۔ آرمی اسکول کے بچے تو بلا تکلف آپس میں ہنسی مذاق کرتے رہتے تھے اور جب ان کے ہنسنے کی آوازیں دوسرے لوگوں کے کانوں سے ٹکراتی تھیں تو پتہ نہیں مدرسے کے بچے ہی ان کے چہروں کو کیوں حریفانہ نظروں سے تاکتے رہتے تھے۔ بس اسٹاپ پر یہ سلسلہ کئی برسوں سے جاری تھا۔ دینی مدارس کے طلبہ میں پندرہ سولہ برس کا ایک لڑکا بھی تھا جو امن کا ہمسایہ بھی تھا اور دوست بھی۔ اکثر یہ دونوں گھر سے بس اسٹاپ تک ساتھ ساتھ چلتے چلتے ایک دوسرے کے اسکول کے بارے میں باتیں کرتے رہتے تھے۔ دینی مدرسے کا طالب علم

سفید قمیض شلوار اور سر پر ٹوپی پہنے ہوئے ہوتا تھا اور امن گلے میں ٹائی لگا کر فوجی ڈریس میں ہوتا تھا۔ ہم عمر ہونے کی وجہ سے دونوں آپس میں ایک دوسرے کے لباس اور پڑھائی پر بلا تکلف بحث و تکرار کرتے رہتے تھے۔ ایک دن دینی مدرسے کا طالب علم اپنی تعلیم پر فخر کرتے ہوئے کہنے لگا:

''میں دین کی تعلیم حاصل کرتا ہوں اور جو دین کی تعلیم سے جڑے ہوتے ہیں وہ جنّت میں چلے جائیں گے۔''

''اور جو انگریزی کی تعلیم پڑھتے ہیں۔'' امن تھوڑا سا مرعوب ہوکر پوچھ بیٹھا۔ ''کیا وہ جنّت میں نہیں جائیں گے؟''

''نہیں، ہرگز نہیں۔'' مدرسے والا لڑکا بڑی اکڑ سے بولا۔ ''کیونکہ ہمارے استاد محترم فرماتے ہیں کہ باقی سب علم شیطانی علم ہے جو انگریز اور یہودی پھیلاتے ہیں۔''

''لیکن اگر ہم سائنس نہیں پڑھیں گے تو ڈاکٹر کیسے بنیں گے؟'' امن اپنی تعلیم کی اہمیت جتلانے لگا۔ ''اور میں اپنے ملک کی حفاظت کیسے کروں گا کیونکہ مجھے تو آرمی افسر بننا ہے۔''

''تجھے جو بننا ہے وہ بن جا۔'' مدرسے کا لڑکا جیب سے سرخ رنگ کی چابی نکال کر انگلی میں گھماتے ہوئے بولا۔ ''میں تو تمہیں جنّت میں جانے کا سبق سمجھا رہا ہوں کیونکہ تم میرے دوست ہو۔''

''تمہارے پاس تو بڑی خوب صورت چابی ہے۔'' امن تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھ بیٹھا۔

''ذرا میں بھی تو دیکھوں...!''

''دیکھ لو، پر تم اسے دیکھ کر کیا کروگے۔'' لڑکا چابی اس کی طرف پھینکتے ہوئے بول پڑا۔ ''یہ شیروں کے کام آتی ہے اور تمہیں تو لومڑی بن کر انگریزوں کی تعلیم پڑھنی ہے۔''

''ارے اس پر تو جنّت کی چابی لکھا ہوا ہے۔'' امن چابی کو حیرانی سے تکتے ہوئے بولا۔

''ہاں' یہ جنّت والی چابی ہے۔'' لڑکا اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''پر' یہ انگریزی پڑھنے سے نہیں ملتی ہے۔''

''تو پھر..!'' امن تھوڑا سا سوچ کر پوچھنے لگا۔ ''یہ کس کو ملتی ہے؟''

''اسی کو جو دینی تعلیم پڑھتا ہے۔'' لڑکا چابی واپس لیتے ہوئے بولا۔

''مجھے بھی ایسی ہی چابی دے دو تا کہ مجھے بھی جنّت ملے۔''

''اس کے لئے تمہیں انگریزی اسکول چھوڑ کر مدرسے میں پڑھنا ہوگا۔''

''مگر میرے گھر والے مجھے کہاں مدرسہ میں چھوڑیں گے۔''

''تم خود ہی مدرسے میں چلے آو۔'' لڑکا اسے سمجھانے لگا۔ ''تعلیم تو تجھے حاصل کرنا ہی ہے تو کیوں نہ وہ تعلیم پڑھو جو تجھے جنّت میں لے جائے گی۔''

امن دن بھر جنّت کی چابی کے بارے میں سوچتا رہا.. سوچتا رہا۔ اس کے ذہن میں عجیب طرح کے خیالات گردش کرتے رہے۔ انگریزی کتابوں کو دیکھتے ہی اس کے اندر نفرت سی پیدا ہو رہی تھی۔ اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد وہ جب گھر واپس لوٹا تو وہ اور زیادہ بے چین سا ہو گیا۔ وہ رات بھر جنّت کے خواب دیکھتا رہا۔ صبح اسکول جاتے ہوئے اسے پھر مدرسے والا دوست مل گیا۔ باتوں باتوں میں امن اسے کہنے لگا کہ وہ بھی آج سے مدرسے میں پڑھنے کے لئے آئے گا۔

''وہ تو ٹھیک ہے' مدرسے میں میں تجھے داخلہ دلوا دوں گا۔'' دوست خوش ہو کر بول پڑا۔ ''لیکن کیا تمہارے گھر والے اس کے لئے تیار ہوں گے؟''

''جب انہیں پتہ چلے گا تو میں انہیں بتا دوں گا کہ میں دینی تعلیم ہی پڑھوں گا نہ کہ انگریزی تعلیم۔''

امن کا جواب سُن کر دونوں مدرسے کی طرف چل پڑے۔ ایک استاد جب کلاس

روم میں داخل ہوا تو فوجی وردی میں ملبوس امن پر نظر پڑتے ہی وہ حیران ہو کر طلبہ سے پوچھنے لگا کہ آرمی وردی میں یہ نیا لڑکا کون ہے؟ امن کچھ کہنے سے ہچکچانے لگا لیکن اس کے دوست نے استاد کی حیرانی کو یہ کہہ کر دور کر دیا کہ مولوی صاحب یہ دینی تعلیم پڑھنا چاہتا ہے۔ یہ سُن کر مولوی صاحب کے ہونٹوں پر تبسم پھیل گیا۔ امن دو تین دن تک مدرسے جاتا رہا۔ ایک شام جب وہ گھر واپس آیا تو ماں نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے پوچھا کہ تُو کتنے دنوں سے اسکول نہیں گیا ہے' دن بھر کہاں آوارہ گھومتا پھرتا ہے؟ تھپڑ پڑتے ہی اس کا غصہ چڑھ گیا اور وہ صاف صاف کہہ اٹھا کہ وہ صرف دینی تعلیم ہی پڑھے گا۔ ماں چند دنوں تک اسے سمجھاتی رہی لیکن تھک ہار کر اس نے اپنے شوہر کو فون پر سب کچھ بتا دیا۔ اس کا فوجی شوہر یہ سُن کر پریشان ہو گیا اور وہ امن کو فون پر بلا کر پوچھنے لگا۔

''تُو اپنا اسکول چھوڑ کر مدرسے میں کیوں چلا گیا ہے۔''

''میں دینی تعلیم پڑھنا چاہتا ہوں۔'' ڈر کی وجہ سے وہ دھیمی آواز میں بول پڑا۔ ''تاکہ مجھے جنّت ملے۔''

اس کا والد یہ سُن کر حیران ہوا۔ اس کی سمجھ میں تھوڑا تھوڑا کچھ آنے لگا کہ شاید امن کو کسی نے غلط گائیڈنس کی ہے' کیونکہ ملک کے حالات خراب ہیں اور کچھ لوگ ذاتی مفاد کی خاطر اسلام کی سچی تعلیم کو غلط رنگ میں پیش کرتے ہوئے نوجوانوں کو بگاڑ رہے ہیں۔ وہ امن کو سمجھانے لگا:

''بیٹا' تُو جس اسکول میں پڑھتا ہے وہاں سے پڑھ لکھ کر افسر بن جائے گا اور اپنے ملک کی سچی خدمت اور حفاظت کر کے بھی جنّت کما سکتا ہے۔''

''نہیں' وہاں انگریزوں کی تعلیم پڑھائی جاتی ہے اور انگریز مسلمانوں کے دشمن ہیں۔'' امن جذباتی لہجے میں بول پڑا۔

فوجی افسر یہ سُن کر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ سخت پریشان ہو گیا۔ اب وہ سخت لہجہ اختیار

کر کے امن کو دھمکی بھری آواز میں سمجھانے لگا:

''یہ کن لوگوں کے بہکاوے میں آ کر تُو خود کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کو بھی تباہ کرنے جا رہا ہے۔ان مفاد پرستوں نے تو اسلام کے نام پر غیر اسلامی کام کرتے ہوئے ساری دنیا کو پریشان کر رکھا ہے۔ اچھا ٹھیک ہے، میں ایک ہفتے کے بعد گھر آ کر تجھے خود سمجھا دوں گا۔''

ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد جب فوجی افسر چھٹی پر گھر واپس آیا تو گھر کا ماتمی ماحول دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ امن پچھلے پانچ دنوں سے لاپتہ ہے۔نہ مدرسہ والوں کو کچھ خبر ہے اور نہ ہی پولیس کچھ پتہ معلوم کر سکی۔امن کے والد نے بھی بہت دنوں تک اسے ڈھونڈنے کی بے حد کوشش کی اور آخر کار مایوس ہو کر وہ ڈیوٹی پر روانہ ہو گیا۔

ملک کے حالات دن بہ دن زیادہ خراب ہو رہے تھے۔ ہر روز کہیں نہ کہیں سے خون خرابے اور خودکش حملوں کی دلدوز خبریں آ رہی تھیں ۔ آئے روز درجنوں معصوم انسان موت کا نوالہ بن رہے تھے۔پولیس اور فوج بڑی جانفشانی سے موت کے سوداگروں کا مقابلہ کر رہے تھے اور یہ بزدل سوداگر اپنی خفت مٹانے کے لئے عام شہریوں اور اسکولی بچوں کو اپنی وحشیانہ حرکت کا نشانہ بنا رہے تھے۔امن اپنے دوست کے ساتھ کئی مدرسوں میں داخلہ لیتا رہا لیکن تین چار مہینے گزر جانے کے بعد اس نے ایک دن اپنے دوست سے کہا کہ ان مدارس میں تو صرف قرآن کی تعلیم پڑھائی جاتی ہے اور دین کی دوسری باتیں مثلاً نماز، روزہ اور حج وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ تعلیم تو مجھے مولوی صاحب اپنے گھر پر بھی دیتے تھے۔تمہاری وہ جنّت والی چابی تو کہیں پر بھی ان مدارس میں نظر نہیں آ رہی ہے۔اس کا دوست یہ سُن کر ہنسنے لگا اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا کہ جنّت کی چابی ان مدارس میں کہاں ملے گی، یہاں تو امن اور خوشحالی کی تعلیم ہی دی جاتی ہے، ان مدارس میں اتنے دن گزارنے سے ایک ہی فائدہ ہو سکتا ہے، وہ یہ کہ

جب ہم جنّت والی چابی کے لوگوں کو یہ بتا دیں گے کہ ہم لوگوں نے اتنے مدرسوں میں دینی تعلیم حاصل کی ہے تو وہ ہمیں بلاتردّد اپنے گروپ میں شامل کریں گے۔ انہیں اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ہے کہ کس نے کتنا دین سمجھ رکھا ہے۔

امن یہ سُن کر پوچھنے لگا کہ وہ تو ٹھیک ہے مگر ہم کب اُن کے ساتھ ملیں گے۔

بس ایک مہینے کی بات ہے۔ میں نے ایک جان پہچان والے سے بات کی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اسی مہینے ان لوگوں کا ایک اجلاس ہونے والا ہے‘ اسی دن ہم ان کی تنظیم کا حصہ بنیں گے۔ فی الحال ہمیں اسی مدرسے میں ٹھہرنا پڑے گا لیکن یہاں کسی سے بھی اس بارے میں کوئی بات مت کرنا نہیں تو مدرسے والے ہمیں یہاں سے نکال دیں گے۔ بیس پچیس دن گزر جانے کے بعد یہ دونوں اجلاس میں شامل ہوئے۔ ان سے پوچھ تاچھ کے بعد انہیں ٹریننگ کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ ٹریننگ کیمپ ایک ویران گھاٹی میں قائم تھا۔ وہاں پر جدید مواصلاتی نظام کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے ہتھیار موجود تھے۔ وہاں پر بہت سارے نوجوان تربیت حاصل کر رہے تھے اور ان لوگوں کی ذہن سازی کے لئے مرنے مارنے کی فلمیں بھی دکھائی جاتی تھیں اور جہاد کے نام پر جوشیلی تقریریں بھی کی جاتی تھیں۔ نئے افراد کی ذہن سازی کے بعد انہیں ہتھیار چلانے کی تربیت دی جاتی تھی۔ کئی مہینوں کی ٹریننگ کے بعد ایک دن ایک آدمی نوجوانوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے اردگرد کئی ہتھیار بند نوجوان موجود تھے۔ ہر ایک انہیں امیر صاحب کہتا تھا۔ وہ پچاس پچپن کی عمر کا معلوم ہوتا تھا۔ وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ مائیک پر تقریر کرنے لگا اور پھر جوشیلے انداز میں بول پڑا:

”ہمارے جانباز نوجوانو! ہمارا دین ہمیں بہادری کی تعلیم دیتا ہے‘ اور بہادر وہی ہوتا ہے جو جہاد کے راستے پر نکلتا ہے۔ آپ لوگوں نے بھی جہاد کا راستہ پسند کیا ہے‘ جو سیدھا جنّت کا راستہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ان کافروں اور ان کا ساتھ دینے والوں ‘جو خود کو مسلمان بھی کہتے ہیں‘ کا نام ونشان مٹا دو گے۔“

امیر صاحب کی جوشیلی تقریر سے نوجوانوں کے جذبات بھڑک اٹھے اور ہر طرف ''امیر صاحب زندہ باد'' اور ''سبیلنا، سبیلنا۔۔ الجہاد الجہاد'' کے نعروں سے ساری گھاٹی گونجنے لگی۔ نعرے سن کر امیر صاحب کا سینہ خوشی سے چوڑا ہو گیا۔ اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے اس نے سرخ رنگ چابیوں کا ایک گُچھا اپنی جیب سے نکالا اور زوردار آواز میں کہنے لگا:

''یہ جنّت کی چابیاں ہیں، آپ میں سے جو بھی جنّت میں جانا چاہتا ہے وہ چابی لے کر جنت میں جانے کی تیاری کرے تاکہ وہاں پہنچ کر اپنی چابی سے جنّت کا دروازہ کھولے۔''

بہت سارے نوجوانوں کے ساتھ ساتھ امن بھی امیر صاحب کے ہاتھ سے چابی لینے میں کامیاب ہو گیا۔ امیر صاحب چابیاں بانٹ کر دوبارہ ان لوگوں سے مخاطب ہوئے کہ کل ہم لوگوں کو ایک بڑا کارنامہ انجام دینا ہے جس کے لئے ہمیں پانچ مجاہدین کی ضرورت ہے۔ یہ سُن کر دوسرے افراد کے ساتھ ساتھ امن کا دوست بھی کھڑا ہو گیا اور انہیں سامنے کھڑی گاڑی میں بٹھا کر لے جایا گیا۔

دوسرے روز امیر صاحب پھر سے مائیک پر نمودار ہوئے اور دوران تقریر انہیں سیٹ پر مسیج موصول ہوا کہ ہمارا مشن کامیاب ہو گیا۔ فوجی گاڑی مکمل طور پر تباہ ہو گئی، بہت سارے دشمن واصل جہنم ہو گئے اور ہمارے سبھی مجاہدین شہید ہو گئے۔ امیر صاحب مائیک پر بڑے فخر سے ابھی کامیابی کی یہ خوش خبری سنا ہی رہے تھے کہ سیٹ پر ایک اور مسیج آئی:

''امیر محترم، انکاؤنٹر کے دوران بازار میں دوسرے سویلین کے ساتھ ساتھ آپ کا نوجوان بیٹا بھی شہید ہو گیا ہے۔''

یہ خبر سنتے ہی امیر صاحب کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ حواس باختہ ہو کر چلّانے لگے:

''اے خدا، مجھ پر یہ کون سا قہر ٹوٹ پڑا، یہ میرے کن گناہوں کی سزا

ہے۔میرے معصوم بیٹے نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔''

امیر صاحب کو چند لوگوں نے تھام کر کرسی پر بٹھا دیا اور ایک نوجوان مائیک سنبھال کر پُر جوش تقریر کرتے ہوئے کہنے لگا:

''ہم دشمن کے دباؤ میں نہیں آنے والے ہیں۔انہوں نے اگر ہمارے امیر صاحب کے ایک بے گناہ بیٹے کو شہید کر دیا ہے تو ہم کل ہی ان سے اس کا خوفناک بدلہ لیں گے کیونکہ ہم سب امیر صاحب کے بیٹے ہیں۔''

ہر طرف سے امیر صاحب زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے۔ایک دو گھنٹے کے بعد امن کو میٹنگ میں بلایا گیا۔وہاں پر اسے کل کے مشن کے بارے میں پوری تفصیلات دی گئیں۔امن بڑے جذباتی انداز میں یہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا کہ وہ کل ہی یہ خودکش حملہ کر کے دشمنوں سے امیر صاحب کے بیٹے کا بدلہ لے گا۔امن عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد ''جہاد کیسے کریں'' نامی کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔ایک جگہ پہنچ کر وہ تھوڑا ٹھہر کر کچھ سوچنے لگا کیونکہ وہاں پر لکھا ہوا تھا:

''اسلام میں کسی بے گناہ کا قتل کرنا تمام انسانیت کا قتل کرنے کے برابر ہے۔''

وہ تھوڑا بہت غور کرنے کے بعد بس اسی نتیجے پر پہنچا کہ امیر صاحب مجھ سے زیادہ جانتے ہیں اس لئے مجھے یہ کام کر کے جنّت میں ضرور جانا ہے۔صبح سویرے اسے کیمپ سے نکال کر گاڑی میں بٹھایا گیا۔گاڑی روانہ ہو گئی۔سفر کے دوران امن کے دماغ میں صرف جنّت کے خیالات آتے رہے۔اس کی سوچ پر امیر صاحب کی سحر آمیز باتوں نے ایسا زہریلا اثر ڈالا تھا کہ وہ بلا سوچے سمجھے نہ صرف خود کو بلکہ اپنے پورے ملک کو آگ میں جھونکنے جا رہا تھا۔تین گھنٹے کی مسافت کے بعد یہ لوگ شہر میں پہنچ گئے۔فوجی یونیفارم پہنانے کے بعد اس کے ہاتھ میں بارود بھرا بستہ دیا گیا تاکہ آرمی اسکول میں دوسرے بچوں کے ساتھ جاتے ہوئے کسی کو بھی اس پر کوئی شک نہ ہو جائے۔اسکول کے نزدیک پہنچ کر وہ حیران ہو گیا۔وہ سوچنے لگا کہ یہ تو اسی کا اسکول ہے لیکن یہاں پر تو صرف وطن

پرستی کی تعلیم دی جاتی ہے تو پھر اسی اسکول کو اُڑانے کا کیا مطلب ہے؟ وہ ابھی اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ اسی دوران اسکول کی گاڑیوں سے بچے اترنے لگے اور ہنستے کھیلتے اسکول میں داخل ہوتے رہے۔ وہ ہنستے کھیلتے بچوں کی معصوم صورتوں کو بڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی نظر اپنے چھوٹے بھائی پر بھی پڑی۔ اس کا دل بھر آیا کہ وہ اپنے بھائی کو گلے لگا کر خوب چومے لیکن یہ سوچتے ہی اسے خیال آیا کہ وہ اس وقت ایک اہم مشن پر ہے۔ یہ دہشت ناک خیال آتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ چند قدم چلنے کے ساتھ ہی اچانک اس کے قدم رک سے گئے وہ ان ننھے منّے پھول سے چہروں کو دوبارہ دیکھنے لگا۔ اس کی نظر پھر اپنے چھوٹے بھائی پر پڑی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے اس کا چھوٹا بھائی بانہیں پھیلا پھیلا کر یہ کہتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہا ہے:

''بھیّا' تُو اتنے دنوں تک کہاں کھو گیا تھا۔ تیرے کھو جانے کے بعد ماں کی دنیا بھی کہیں کھو گئی ہے۔ اس کے آنسوؤں سے گھر میں سیلاب آیا ہوا ہے۔ بھیّا' گھر واپس لوٹ آ، تاکہ گھر میں پھر سے خوشیوں کی شہنائی بج اٹھے۔''

ماں کا خیال آتے ہی جذبات کا سمندر موجیں مارنے لگا اور آنسو بن کر آنکھوں سے بہنے لگا۔ دل کی تیز دھڑکن نے اسے عجیب سی کشمکش میں ڈال دیا۔ وہ سوچنے لگا:

''میرا باپ تو اپنے ملک کا محافظ ہے۔ میری ماں بھی اچھے طریقے سے دین کی باتوں پر عمل کر رہی ہے۔ ہمارا گھر تو کسی کافر کا ساتھ نہیں دے رہا ہے تو پھر میں کیوں دوسرے معصوم بچوں کے ساتھ ساتھ اپنے پیارے بھائی کو بھی بے گناہ مار ڈالوں۔''

اس کے ذہن میں پھر کتاب کا جملہ آ گیا کہ اسلام میں بے گناہ کو مارنا گناہ عظیم ہے۔ وہ قدم پیچھے ہٹاتے ہوئے پھر سوچنے لگا:

''نہیں یہ جہاد نہیں' فساد ہے فساد۔ اسلام تو امن قائم کرنے کے لئے جہاد کی تعلیم دیتا ہے لیکن یہ جاہل تو جہاد کے نام پر دہشت گردی کا کاروبار چلاتے ہیں۔ یہ تو ہمارے ملک کو تباہ کرنے کی سازش ہے۔ جو لوگ نافہم نوجوانوں کو خون خرابہ کرنے کا درس دے

کر جنّت کے سبز باغ دکھاتے ہیں وہ تو مفاد پرست خود اسلام اور ہمارے ملک کے دشمن ہیں۔ نہیں، میں اُن سیاہ سوچ رکھنے والوں کے سیاہ کارناموں کو ضرور ناکام بنادوں گا۔''

جھوٹ اور مکاری کے پردے چاک ہو گئے۔ امن اُلٹے پاؤں واپس مڑا اور سیدھے فوجی بنکر میں چلا گیا۔ فوجی اسے دیکھتے ہی چوکنا ہو گیا اور امن کو اسکولی وردی میں دیکھ کر ذرا اطمینان سے پوچھنے لگا:

''کون ہو تم اور بنکر میں کیوں گھس آئے؟''

''میں بھٹکا ہوا راہی ہوں۔'' امن نے آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

''ادھر کیوں چلے آئے، اسکول تو وہاں ہے۔'' فوجی بندوق تانتے ہوئے دوبارہ پوچھ بیٹھا۔ ''اور انگلی میں یہ چابی کیوں گھما رہے ہو؟ ذرا ادھر تو دکھانا۔''

''ارے اس پر تو جنت کی چابی لکھا ہے۔'' فوجی چابی کو گھورتے ہوئے بول پڑا۔

جنّت والی چابی کا نام سنتے ہی امن کے اندر کی آگ بھڑک اٹھی اور منہ سے نفرت کا شعلہ نکل پڑا:

''نہیں، یہ جنّت کی نہیں بلکہ جہنم کی چابی ہے۔''

OOO

پھول اور خوشبو

آسمان کی بارش سے سمندر کا پیٹ پُر ہو رہا تھا۔ دھوپ نکلتے ہی جب سورج کی کرنیں سمندر کے سینے کو چیرنے لگیں تو بارش کا یہی پانی بھاپ بن کر پھر سے آسمان کی جانب اٹھنے لگا۔ چالیس سال سے وہ اپنے گھر کے کتب خانے کی سمندر والی کھڑکی سے یہ نظارہ دیکھتا آیا تھا۔ بچپن میں جب وہ بارش اور سمندر کا یہ نظارہ دیکھتا تو لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے اندر ایک عجیب قسم کا اضطراب پیدا ہو جاتا اور یہ اضطراب اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتا جب وہ بارش تھم جانے کے بعد آسمان کی طرف دیکھتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا:

''بارش سے سمندر.. سمندر سے بارش اور پھر بارش سے سمندر.. کتنا حسین رشتہ ہے۔ ان دونوں کا وجود ایک دوسرے کے بغیر ادھورا ہے۔''

بچپن میں اس کی سوچ بس اسی خیال تک محدود تھی۔ لیکن عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ روح کی بے قراری میں اضافہ ہوتا گیا۔ صبح کے وقت وہ مکتب چلا جاتا اور اس کے بعد سرکاری اسکول۔ ایک دن جب استاد نے بورڈ پر درخت اور سیب کی تصویر بنائی اور نیوٹن کے فارمولے 'کشش ثقل' کو سمجھانے لگا کہ پیڑ سے سیب اسی کشش کی وجہ سے زمین پر گرتا ہے یعنی یہ زمین اور سیب کا رشتہ ہوا تو اس کے اندر سمندر بارش کا تعلق موجیں مارنے لگا اور روح میں ایک ہلچل سی مچ اٹھی۔ یہی کیفیت اس پر اذان کے الفاظ ''حی علی الفلاح'' سن کر طاری ہو جاتی اور مسجد میں جا کر نماز پڑھنے کے ساتھ ہی اس کی روح

تسکین کی مٹھاس سے سرشار ہو جاتی۔ پھر وہ مسجد کے مکتب میں کچھ دیر تک امام صاحب کے پاس بیٹھ جاتا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ آنکھیں بند کر کے پند و نصیحت سے اطمینان کی سانس لیتا۔

جب اس کی سوجھ بوجھ تھوڑی بہت بڑھ گئی تو بارش اور سمندر کے کھیل کا چکر اس پر زیادہ اثر انداز ہونے لگا۔ وہ کئی کئی گھنٹوں تک روح کی پیاس کے بارے میں کھو کر سوچتا رہتا۔ موسم سرما میں ایک دن وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر صحن کے پیڑ پر بیٹھے ایک گم سم پرندے پر پڑی۔ پرندہ بہت خوبصورت تھا۔ جو کہ سرما میں کسی اور خطہ سے ہجرت کر کے وہاں چلا آیا تھا کیونکہ اس موسم میں اکثر دوسرے خطوں کے پرندے وہاں آتے رہتے تھے۔ لیکن اس کی مایوس صورت سے لگ رہا تھا کہ غالباً اپنے ساتھی کے بچھڑنے کے فراق میں اس کا دل ڈوبتا جا رہا ہے۔ دھیرے دھیرے اسے بھی ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کی روح کسی مہاجر پرندے کی طرح اپنے ساتھی کی تلاش میں ازل سے بے چین بھٹک رہی ہے۔

وہ اب جوانی کی سرحد کو پار کر چکا تھا۔ لیکن اب بھی صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد مکتب میں بزرگ مولوی صاحب کے درس میں بیٹھ جاتا۔ مولوی صاحب کبھی کبھار فرماتے تھے:

''آپ کی موجودگی سے دل میں ایک سکون سا آ جاتا ہے نہیں تو بیشتر لوگ بس بچپن کے ایام میں ہی مکتب کا رخ کرتے ہیں اور دین کی چند باتیں سیکھ کر دنیا کے رنگ میں کھو جاتے ہیں۔''

مولوی صاحب کی باتیں سن کر اس کے دل میں بھی اطمینان کی لہر سی اٹھتی۔ کئی بار اس نے سوچا کہ وہ مولوی صاحب سے دل کی بات بتائے کہ اس کی روح ہمیشہ بھٹکتی رہتی ہے لیکن کبھی دوسرے لوگوں کی موجودگی اور کبھی کہنے کا خوف اس کے آڑے آتا۔ جب

دل کے سمندر میں سونامی کی لہروں نے زیادہ ادھم مچائی تو دماغ کی نسیں پھٹنا محسوس ہوئیں اور احساس نے لفظوں کی صورت اختیار کی:

''حضرت، بچپن سے میرا دل بے قرار ہے۔ میری روح ہمیشہ تڑپتی رہتی ہے جیسے کوئی پرندہ اپنے ساتھی سے بچھڑ گیا ہو اور اپنے بچھڑے ساتھی کے وصال کے لئے تڑپ رہا ہو۔''

بزرگ مولوی صاحب یہ سن کر اس کے چہرے کو تکنے لگے۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد انہوں نے معروف صوفی بزرگ سید علی ہجویریؒ کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا:

''نفس کو اس کی خواہش سے دور رکھنا حقیقت کے دروازے کی چابی ہے۔''

یہ قول سنتے ہی اس پر لرزا طاری ہو گیا اور خوفزدہ ہو کر پوچھا:

''یہ حقیقت کا دروازہ کیا ہے؟''

''محبوب کے وصال کا دروازہ۔''

''اس کا راستہ...؟''

''مرشد کی تربیت۔''

''مرشد کی پہچان۔''

یہ سنتے ہی مولوی صاحب نے تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کیں اور پھر فرمایا:

''دراصل یہ دل کا جہان ہوتا ہے۔ جب بھی دل کسی پاک روح کی رفاقت قبول کرتا ہے تو پہچان کا سرا ہاتھ آتا ہے۔''

پہچان کا سفر شروع ہوا۔ دِل کا جہان مرشد کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ کہیں سراب ہی سراب نظر آتا اور کہیں پر پھول کی صورت میں کانٹے ہی کانٹے دکھائی دیتے۔ روح میں جب اضطراب کی کیفیت حد سے زیادہ بڑھنے لگی اور ذہن پر ایک عجیب سا غبار اچھا گیا

تسکین کی مٹھاس سے سرشار ہوجاتی۔ پھر وہ مسجد کے مکتب میں کچھ دیر تک امام صاحب کے پاس بیٹھ جاتا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ آنکھیں بند کر کے پند ونصیحت سے اطمینان کی سانس لیتا۔

جب اس کی سوجھ بوجھ تھوڑی بہت بڑھ گئی تو بارش اور سمندر کے کھیل کا چکر اس پر زیادہ اثر انداز ہونے لگا۔ وہ کئی کئی گھنٹوں تک روح کی پیاس کے بارے میں کھوکر سوچتا رہتا۔ موسم سرما میں ایک دن وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر صحن کے پیڑ پر بیٹھے ایک گم سم پرندے پر پڑی۔ پرندہ بہت خوبصورت تھا۔ جو کہ سرما میں کسی اور خطہ سے ہجرت کر کے وہاں چلا آیا تھا کیونکہ اس موسم میں اکثر دوسرے خطوں کے پرندے وہاں آتے رہتے تھے۔ لیکن اس کی مایوس صورت سے لگ رہا تھا کہ غالباً اپنے ساتھی کے بچھڑنے کے فراق میں اس کا دل ڈوبتا جا رہا ہے۔ دھیرے دھیرے اسے بھی ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کی روح کسی مہاجر پرندے کی طرح اپنے ساتھی کی تلاش میں ازل سے بے چین بھٹک رہی ہے۔

وہ اب جوانی کی سرحد کو پار کر چکا تھا۔ لیکن اب بھی صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد مکتب میں بزرگ مولوی صاحب کے درس میں بیٹھ جاتا۔ مولوی صاحب کبھی کبھار فرماتے تھے:

''آپ کی موجودگی سے دل میں ایک سکون سا آجاتا ہے نہیں تو بیشتر لوگ بس بچپن کے ایام میں ہی مکتب کا رخ کرتے ہیں اور دین کی چند باتیں سیکھ کر دنیا کے رنگ میں کھوجاتے ہیں۔''

مولوی صاحب کی باتیں سن کر اس کے دل میں بھی اطمینان کی لہر سی اٹھتی۔ کئی بار اس نے سوچا کہ وہ مولوی صاحب سے دل کی بات بتائے کہ اس کی روح ہمیشہ بھٹکتی رہتی ہے لیکن کبھی دوسرے لوگوں کی موجودگی اور کبھی کہنے کا خوف اس کے آڑے آتا۔ جب

دل کے سمندر میں سونامی کی لہروں نے زیادہ ادھم مچائی تو دماغ کی نسیں پھٹتا محسوس ہوئیں اور احساس نے لفظوں کی صورت اختیار کی:

''حضرت، بچپن سے میرا دل بے قرار ہے۔ میری روح ہمیشہ تڑپتی رہتی ہے جیسے کوئی پرندہ اپنے ساتھی سے بچھڑ گیا ہو اور اپنے بچھڑے ساتھی کے وصال کے لئے تڑپ رہا ہو۔''

بزرگ مولوی صاحب یہ سن کر اس کے چہرے کو تکنے لگے۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد انہوں نے معروف صوفی بزرگ سید علی ہجویریؒ کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا:

''نفس کو اس کی خواہش سے دور رکھنا حقیقت کے دروازے کی چابی ہے۔''

یہ قول سنتے ہی اس پر لرزا طاری ہو گیا اور خوفزدہ ہو کر پوچھا:

''یہ حقیقت کا دروازہ کیا ہے؟''

''محبوب کے وصال کا دروازہ۔''

''اس کا راستہ..؟''

''مرشد کی تربیت۔''

''مرشد کی پہچان۔''

یہ سنتے ہی مولوی صاحب نے تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کیں اور پھر فرمایا:

''دراصل یہ دل کا جہان ہوتا ہے۔ جب بھی دل کسی پاک روح کی رفاقت قبول کرتا ہے تو پہچان کا سرا ہاتھ آتا ہے۔''

پہچان کا سفر شروع ہوا۔ دِل کا جہان مرشد کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ کہیں سراب ہی سراب نظر آتا اور کہیں پر پھول کی صورت میں کانٹے ہی کانٹے دکھائی دیتے۔ روح میں جب اضطراب کی کیفیت حد سے زیادہ بڑھنے لگی اور ذہن پر ایک عجیب سا غبار اچھا گیا

توعشق کا سمندر محبوب کے وصال کے لئے موجیں مارنے لگا۔اب نماز کے وقت بھی دل میں، اُبلتی ہانڈی کی طرح جوش آتا رہتا۔سفرِ پہچان جب طویل ہوا تو ایک رات خواب میں ایک نورانی چہرے کا دیدار نصیب ہوا۔صبح کی نماز پڑھنے کے بعد خواب کا ذکر مولوی صاحب کے سامنے کیا گیا۔یہ سنتے ہی مولوی صاحب کی آنکھوں میں نور سا پھیل گیا اور وہ کافی دیر تک اس کے چہرے کو تکنے کے بعد بولے:

''انجم عثمانی صاحب..کیا آپ کو اپنے نام انجم کا معنی پتا ہے۔''

''جی مولوی صاحب..ستارہ۔''

''بے شک تم ایسے روشن ستارے ہو جو اپنی منزل کو پہنچنے والا ہے۔مبارک ہو۔جاؤ، اس پاک روح کا مسکن مشرقی گلستان کے نزدیک ہے۔''

سفر طویل تھا لیکن روح کی پیاس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔اہلِ خانہ سے رخصت لے کر وہ سفر کے لئے نکل پڑا۔ایک رات وہ ایک ایسی بستی میں پہنچا جہاں پر اس کا کوئی جان پہچان والا نہیں تھا۔عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد جب لوگ ایک ایک کر کے نکلنے لگے تو وہ مسجد کے قریب ہی ایک باغ میں ہی ٹھہرا اور چادر بچھا کر لیٹ گیا۔چند لمحوں کے بعد ایک اور آدمی سلام کرنے کے بعد اس کے نزدیک آکر بیٹھ گیا۔چاند کی روشنی ہر طرف چمک رہی تھی۔اس آدمی نے تھیلی سے کھانے کا سامان نکالا اور اسے آواز دے کر کھانے کے لئے کہا۔وہ یہ سُن کر کھڑا ہوا اور دونوں کھانا کھانے لگے۔کھانے کے دوران تعارف ہوا اور باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ دونوں ایک ہی منزل کے راہی ہیں۔اسی دوران وہاں پر ایک کتا نمودار ہوا۔اس آدمی نے تھیلی کا منہ کھول کر ایک روٹی نکالی اور ٹکڑے کر کے کتے کی طرف پھینکی۔یہ دیکھ کر اس نے آدمی سے پوچھا:

''یہ کتا اچانک کہاں سے آگیا۔''

''یہ میرے ساتھ ہے۔''اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔''ویسے کتا تو انسان کے

ساتھ ہی ہوتا ہے۔''

''انسان کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔'' وہ حیراں ہو کر بولا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں!''

''بزرگ فرماتے ہیں کہ انسان کا نفس بھی کتے کی طرح ہوتا ہے۔'' اس نے کتے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر قابو میں رہا تو دوست بن جائے گا، اگر قابو سے باہر ہو گیا تو دشمن۔ پھر انسان کو تباہ کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔''

یہ سُن کر اس کو ایک جھٹکا سا لگا جیسے اچانک کسی بچھو نے کاٹا ہو۔ وہ کبھی اس آدمی کی طرف، کبھی کتے کی طرف اور کبھی خود کو دیکھتا رہا۔ آدھی رات تک وہ نفس اور کتے کا موازنہ کرتا رہا۔ پھر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد دونوں سفر پر روانہ ہوئے۔ آج کا دن ان دونوں کے لئے خوشی کا دن تھا کیونکہ کئی روز کی مسافت کے بعد وہ پاک روح بزرگ تک پہنچنے والے تھے۔ شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ دونوں پاک روح کے مسکن پر پہنچ گئے۔ اپنا تعارف اور مقصد بتانے کے بعد انہیں مسافر خانے میں ٹھہرایا گیا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد اس آدمی نے چند روٹیاں ہاتھ میں لے کر باہر کُتّے کو کھلائیں۔ نصف شب سے پہلے انہیں بزرگ کے دربار میں حاضر کیا گیا۔ بزرگ کا نورانی چہرہ دیکھ کر دونوں کے دل خوشی سے شاد ہوئے۔ ذکر واذکار کا دور شروع ہوا۔ ہر طرف نورانی ماحول پھیلا ہوا تھا۔ کمرہ لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ نصف شب کے بعد بزرگ کے منہ سے اصلاح نفس کے موتی نکلنے لگے:

''اپنے نفس کو قابو میں رکھو۔ شیطان کا وار نفس پر ہی ہوتا ہے۔ وہ نفس کو دھوکہ دے کر پھول سے کانٹا بنا دیتا ہے۔ اس کے لئے وہ انسان کی عقل کو اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کرتا ہے اور باطل پر حق کا رنگ چڑھا کر انسان کو گمراہ کر دیتا ہے۔ اس لئے جب ایسا محسوس ہو کہ عقل بھٹک رہی ہے تو دل کے جہان میں عافیت تلاش کرو۔ کیوں دل گلاب کی طرح ہوتا ہے اور دماغ کانٹوں کی طرح الجھتا رہتا ہے۔''

بزرگ کی تربیت سے لوگوں کے دل سرشار ہوئے اور وہ ایک ایک کر کے وہاں سے نکل پڑے۔اس کے دل میں نور کی نئی کرنیں اترنے لگیں۔وہ رات دیر تک بزرگ کی باتوں کے سحر میں کھویا رہا۔کئی مہینوں تک تربیت کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ایک شب انہیں بزرگ سے ملاقات کے لئے لے جایا گیا۔دونوں احترام کے ساتھ بزرگ کے سامنے بیٹھ گئے۔بزرگ ذکرواذکار سے فارغ ہو کر شگفتہ لہجہ میں بولے:

''اللہ کے بندو! کس مقصد سے آئے ہو؟''

بزرگ کی شیریں آواز سے دونوں کے دلوں میں ٹھنڈک پڑ گئی۔انجم عثمانی نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا:

''حضرت! بچپن سے میرا دل کسی نامعلوم محبت کے لئے تڑپتا رہتا ہے۔میرے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود میری روح کسی بچھڑے پرندے کی طرح اپنے رفیق کے فراق میں سرگرداں رہتی ہے۔کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں کسی بڑے سمندر کا بچھڑا ہوا قطرہ ہوں جو سمندر کے وصال کی تڑپ میں مرا جارہا ہو۔''

بزرگ نے یہ سُن کر اطمینان کی سانس لی اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولے:

''یہ حقیقت کی تلاش کی کیفیت ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔''

''حقیقت کی کیفیت..؟'' وہ ملائم لہجے میں بولا۔''حضرت..یہ کون سی کیفیت ہوتی ہے؟''

''یہ روح کی وہ کیفیت ہوتی ہے جس کی طرف مولانا رومیؒ نے اشارہ کیا ہے کہ کنویں سے پانی کا ڈول نکالتے وقت وہ بھاری اس لئے ہو جاتا ہے کیونکہ وصل کے فراق میں کنویں کے پانی کی کشش اسے اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔''

''حضرت، اس کے مطلب سے ہمیں آگاہ کریں۔''

''یہ عشقِ حقیقی کی کیفیت ہوتی ہے جو خدا اور بندے کے عشق کے درمیان ایک

راز ہوتا ہے۔"

"اس کا علاج کیا ہے تا کہ میری پیاسی روح کی پیاس بجھ جائے۔"

"بس اس کیفیت کو ایسے ہی رہنے دیں کیونکہ یہ مبارک روح کا جوہر ہے اور اپنے محبوب کا عشق ہمیشہ اپنی روح میں بسائیں۔ جس طرح پھول اور خوشبو کا عشق ہوتا ہے۔"

"لیکن وصال کی کیا صورت ہے؟"

"بس خالق کے فرمان کو احساس کا حصہ بناؤ جو تمہیں آخرت میں محبوب کے دیدار سے سرخرو کرے گا۔"

"وہ فرمان کیا ہے؟"

"نحن اقرب الیہ من حبل الورید"

(ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس (انسان) کے قریب ہیں)

یہ نورانی پیغام سنانے کے بعد وہ رخصت کر دیے گئے۔

برسوں بعد اس کی روح کو تسکین مل گئی۔ دوسرا آدمی وہیں پر ٹھہر گیا کیونکہ وہ مزید تربیت کا خواہاں تھا۔ لیکن صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ اطمینانِ قلب کے ساتھ گھر کی جانب نکل پڑا۔ نئے سال کا سرما تھا۔ وہ شام کے وقت گھر پہنچ گیا۔ سبھی لوگ اس کو دیکھ کر خوش ہو گئے۔ صبح کے وقت وہ کتب خانے میں بیٹھا تھا کہ اس کی نظر پیڑ کی طرف اٹھی۔ وہاں کا خوبصورت منظر دیکھ کر اس کا دل خوش ہوا کیونکہ پیڑ پر پرندوں کے جوڑے کی چہچاہٹ سے خوشی کا سماں بندھا ہوا تھا۔

○○○

ہائی جیک

(مزاحمتی افسانہ)

سیاہ بادلوں کی کڑکتی بجلیوں نے پُرسکون سمندر کی خاموش لہروں کو سونامی کا روپ دھارنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس کا جزیرہ نما دل بھڑکتے شعلوں کا خندق بن چکا ہے اور برستی آگ کی سلسلہ وار پھٹوں نے اس کے دماغ میں غم اور خوشی کے تصور کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ اس کی غمگین آنکھیں، سنہرے اُجالے کی تلاش میں، کالی رات کے قیامت خیز اندھیرے کو کاٹتے کاٹتے تھک چکی ہیں۔ خوف زدہ دماغ کے مایوس خیالات اسے اشارہ کر رہے ہیں کہ شاید سنہرے اُجالے کے چمکتے آفتاب کی روشن کرنوں کو کالے بادلوں نے قید کر رکھا ہے۔ اس کا ارتعاش شدہ جزیرہ غم ناک سونامی کی خوش آشام لہروں کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ یہ خون آشام لہریں شاہینی سوچ رکھنے والے انسانوں کو ہی اپنا شکار بنا رہی ہیں۔ ان کی اندھی یلغار کا ایک ہی مقصد ہے کہ ہر شاہین کی پرواز آمنا وصدقنا تک محدود رہے۔ پرواز کی ہر آزادی پر قدغن لگائی جائے اور ان کی پسند سب کی پسند...!

اُس کا پریشان دماغ سوچنے کی صلاحیت کے باوجود بھی صحیح سوچ نہیں سکتا کیونکہ اندھیرے نے اس کی سوچ کو ہائی جیک کر رکھا ہے۔ مذہب کا پرستار ہونے کے باوجود بھی وہ مذہب کو اپنا نہیں سکتا۔ مذہب کو اب صرف سیاست کے قالب میں بند کر دیا گیا ہے۔ مذہب کی تعلیم اُسے بتا رہی ہے کہ ہر انسان کو پہلے انسان کی طرح سمجھو اور انسانیت کو ترجیح دو، لیکن وہ مذہبی تعلیم پر کیسے عمل کر سکتا ہے کیونکہ اس کی سوچ تو 'ہائی جیک' ہو چکی

ہے جو اُسے بتا رہی ہے کہ یہاں تو انسان نے اپنی سوچ کا مذہب بنا رکھا ہے۔ یہاں تو ہر قوم اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لئے مذہب کا استحصال کر رہی ہے۔ مذہب' انسان کو اپنی فکر بخشتا ہے لیکن یہاں تو انسان اپنی سوچ کو مذہبی فکر کا لبادہ پہنا رہا ہے اور مذہبی فکر کو اپنی سوچ کی زمین میں ڈال کر نئے نئے نظریات کے پودے اُگا رہا ہے۔ کوئی قدامت پرستی کا اسیر اور کوئی جدیدیت کا یرغمال.. انتہا پسندی، صرف انتہا پسندی..!

دن بھر کی مصروفیات سے تھک ہار کر وہ رات کی تنہائی میں سچ اور جھوٹ کی جنگ کا نظارہ کرنا چاہتا ہے۔ نیوز چینل کا نمبر ریموٹ پر دباتے ہی اسکرین پر فلیش نیوز آتی ہے:

''ڈرون کے حملے میں اسکول تباہ' درجنوں معصوم بچے موت کی آغوش میں۔''

''یہ دہشت گردی ہے' حیوانیت کے شکار معصوم بچوں کے والدین کا احتجاج۔''

''نہیں ایسے اقدام دنیا میں امن بحال کرنے کے لئے ضروری ہیں۔''

سفیرِ امن کا بیان۔

''ایک خوفناک دھماکے میں نیٹو کے درجن بھر فوجی ہلاک۔''

''یہ دہشت گردی ہے۔'' سفیرِ امن کا بیان ''جمہوریت کے دشمنوں سے ضرور بدلہ لیا جائے گا۔''

اس کی سوچ ان خون آشام مناظر کو دیکھتے دیکھتے یہ سمجھنے سے قاصر نظر آرہی ہے کہ اصلی دہشت گرد کون ہے..؟''

وہ ہسٹری چینل کا بٹن دباتا ہے۔ وہاں پر بھی اسے صرف آگ کے گولے ہی نظر آتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے:

''انسان نے لالچ کو اپنا دیوتا بنا لیا ہے اور اس کی حیوانیت کے سیاہ کارنامے لکھتے لکھتے انسانیت کی تاریخ اب بوڑھی ہو چکی ہے وہ اب صحیح اور غلط کو پہچاننے سے بے زار نظر آرہی ہے۔''

مرنے اور مارنے والوں کے فلسفۂ امن کے پروپگنڈہ نے اُس کے ذہن میں انتشار کا طوفان برپا کرر کھا ہے۔ وہ انسانوں کے چینل سے مایوس ہو کر اب حیوانوں کے چینل کا بٹن دباتا ہے۔ اینمل چینل پر افریقہ کے وہ گھنے جنگل دکھائے جارہے ہیں جن میں غیر مہذب جنگلی جانور کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ایک خوبصورت جھیل کے کنارے سینکڑوں ہرن پُرامن ماحول میں پانی پی رہے ہیں۔ جھاڑیوں کے پیچھے خونخوار شیر حملے کی تاک میں بیٹھے ہیں۔ طاقت کے نشے میں مست یہ خونخوار درندے اچانک ہرنوں پر جھپٹ پڑتے ہیں، ہرنوں کے جھنڈ پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ بہت سارے ہرن درندوں کے شکار بن جاتے ہیں۔ زخمی ہرن خوف کے مارے جھیل میں کودتے رہے۔ جھیل کے پُرسکون پانی میں ارتعاش کی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں اور نیلا پانی سرخ مائل ہوتا گیا۔

معصوم ہرنوں کے خون سے درندوں کا پیٹ بھر جاتا ہے اور اُن کے خون آلودہ منہ فتح کی دہاڑ سے گرجنے لگتے ہیں۔ ان درندوں کی گرجدار آواز سارے جنگل میں خوف پھیلانے لگی کہ یہاں ہمیشہ طاقت کی بادشاہت رہے گی۔ یہ خوفناک نظارہ دیکھتے دیکھتے اُس کی سوچ میں اُبال آیا۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کی سوچ ہائی جیکر کے شکنجے سے آزاد ہو رہی ہے اور اس کی زبان سے بے ساختہ نکل پڑا... حیوان کون...؟

ooo

زندگی کا بازار

وہ صبح سویرے کسی دانا شاعر کا یہ دردناک مصرعہ ''زندگی کی سب دکانیں بند ہیں اس شہر میں'' بلند آواز سے گاتا ہوا پاس والی گلی سے گزرتا۔ اس کا درد بھرا آہنگ اس قصبہ نما کالونی کے ہر گمشدہ دل کے ساتھ ساتھ میرے منتشر ذہن پر بھی درد بھرا تیشہ چلا جاتا۔ کچی عمر میں جب بھی اس کی دردناک آواز میری کچی نیند پر بیداری کا ہتھوڑا اچلاتی تو میری ناگوار طبیعت دل ہی دل میں اس کو کوستی رہتی اور میری زبان سے بے ساختہ کسی شاعر یا یہ شعر نکل پڑتا۔

یہ کس نے پھونک دیا صور وقت سے پہلے
اُٹھا ہوں آنکھوں میں اِک خوابِ ناتمام لئے

اُسے وقت کی پابندی کا پورا احساس تھا۔ وہ وقت کی اہمیت سے بے خبر انسانوں کی اس بستی میں جب قدم رکھتا تو گلی گلی کوچہ کوچہ آواز لگاتے لگاتے گزر جاتا۔ گٹھری کے بار سے اُس کی کمر ہمیشہ جُھکی سی رہتی تھی۔ وہ کسی بھی گلی کے نکڑ پر تھوڑی دیر تک منتظر گاہکوں کا انتظار کرتا اور جب گاہک آجاتے تو وہ اپنی گٹھری کا بند منہ کھول دیتا اور بڑی مسرت کے ساتھ ضرورت مند گاہکوں کی حاجت پوری کر دیتا۔ گاہک بھی اپنی من پسند چیزیں خریدنے کے بعد بھی کافی دیر تک اس کے اردگرد دائرے کی صورت میں کھڑے رہتے اور اس کی روح افزا اور دانشمندانہ باتیں سنتے سنتے روحانی طور پُرسکون محسوس کرتے۔ لوگوں کی مادّی اور روحانی حاجت روائی کے بعد وہ گٹھری کا منہ بند کر کے

دوسری گلی کی طرف قدم بڑھاتا اور اس کا یہ سفر طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک روز جاری رہتا۔

میں اکثر محسوس کرتا تھا کہ لوگ بڑے شوق سے اُس کی باتیں دہراتے رہتے ہیں اور اُس کی دانائی کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ غم اور خوشی کی محفلوں میں اُس کا ذکر ضرور رہتا۔ بزرگوں کا کہنا تھا کہ وہ کسی دور دراز دیہات کا رہنے والا ہے اور کئی دہائیوں سے لگاتار پو پھٹتے ہی اس بستی میں قدم رکھتا آیا ہے اور روزی روٹی کمانے کے ساتھ ساتھ وہ بستی کے سُکھ دُکھ میں بھی بغیر کسی لالچ کے شرکت کرتا ہے۔ میں نے کبھی بھی کسی کی زبان سے اُس کے متعلق کوئی ناخوشگوار بات نہیں سنی۔ ہر ایک کی زبان پر اُس کی تعریف ہی ہوتی تھی۔ حدِّ بلوغ تک پہنچتے پہنچتے میرے دل میں اُس کی آواز اُتر تی گئی اور جس صبح اُس کی مانوس آواز میرے کانوں سے نہیں ٹکراتی تو میں حسب عادت وقت پر جاگ جاتا اور نیند بھری آنکھوں سے کھڑکی کھول کر پاس والی سنسان گلی میں دیر تک جھانکتا رہتا۔ اُس کو غیر حاضر پا کر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ساری کالونی پر مایوسی کا عالم چھایا ہوا ہے اور چناروں پر بیٹھے پرندے بھی اپنی اپنی چونچ بغل میں چھپائے مایوس نظر آرہے ہیں۔ میں جب اس مایوس کن ماحول کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا تو میں یہ سمجھنے سے قاصر رہ جاتا کہ یہ بے زبان پرندے کیوں مایوس دکھائی دیتے ہیں، شاید وہ بھی میری طرح مانوس آواز نہ سُن کر مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں۔ انسان سوچ کی بنیاد پر کسی آواز سے خوشی یا غم کا اثر لیتا ہے لیکن یہ پرندے... خیر میں اپنی منتشر سوچ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کھڑکی بند کر دیتا اور کام پر نکلنے کی تیاری میں لگ جاتا لیکن بے قراری کا عالم دن بھر میرے وجود پر چھایا رہتا۔

آہستہ آہستہ اُس کی آواز دوسرے لوگوں کی طرح میری سوچ پر بھی اثر انداز ہوتی گئی اور میں اُس کی صدائے جرس سنتے ہی بستر سے اُٹھتا اور صبح سویرے اس کی مجلس میں چلا جاتا۔ وہ نُکڑ پر کھڑے پرانے گھنے چنار کے سائے تلے اپنی دکان لگاتا۔ بچے،

جوان، بوڑھے اور مرد وزن اس کے اردگرد جمع رہتے۔ اس کی گٹھری میں بچوں سے لے کر بوڑھوں تک کا چھوٹا موٹا گھریلو سامان دستیاب ہوتا تھا۔ بچے جب اُس کی چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرتے رہتے تو ناراض ہونے کے بجائے وہ انہیں ہنستے مسکراتے وہاں سے بھگانے کی کوشش کرتا اور جب کوئی معصوم بچہ اُسے پوچھے بغیر یا پیسہ دئے بغیر کوئی چیز اُٹھا کر کھا جاتا تو وہ اُس کو بھی نہیں ڈانٹتا تھا۔ بچے اکثر اُسے پوچھتے کہ ''پھیری والے چچا! کیا تمہارے گاؤں میں سیب کے باغ ہوتے ہیں؟'' وہ تھیلے سے سیب نکال کر انہیں بڑے پیار سے دیتے ہوئے کہتا ''ہاں! ہمارے گاؤں میں بڑے بڑے سیب کے باغ ہیں۔''

اُس کی گٹھری میں جتنی بھی چیزیں ہوتی تھیں وہ سب بیچتا رہتا۔ ایک سفید کپڑے کے سوا' باقی رنگ کے کپڑے تو وہ فروخت کرتا لیکن وہ سفید کپڑا کسی کو بھی نہیں دیتا تھا۔ ایک مرتبہ جب کسی نے اُسے وہ سفید کپڑا بیچنے کے بارے میں کہا تو وہ تیز لہجے میں بول پڑا کہ:

''زندگی کی مصنوعی چہل پہل نے آپ لوگوں کی سوچ سے موت کا تصور چھین لیا ہے۔۔ یہ میرا کفن ہے نہ جانے کب اور کہاں اس کی ضرورت پڑے گی۔''

میں اس کی حقیقت پسندانہ سوچ پر حیران رہ گیا۔

اتوار کے دن وہ کافی دیر تک چنار کے سائے تلے بیٹھتا رہتا اور لوگ بھی فرصت کے لمحات کا فائدہ اُٹھا کر اُس کے اردگرد جمع رہتے اور ذہنی سکون سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے۔ ایک دن بھری محفل میں کسی نوجوان نے اُس سے پوچھا:

''چچا! آپ کے گاؤں میں جدید سہولیات کی کون کون سی چیزیں دستیاب ہیں۔''

نوجوان کا سوال سُن کر اُس نے ہر طرف نظر گھمائی۔ سامنے عالیشان محل نما مکانات کا ایک گھنا جنگل دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اے سی رومز، کمپیوٹرس، کیبل کنکشنز، نئے ماڈلز کی نئی نئی گاڑیاں، اولڈ ایج ہاوس، چائلڈ کیر سنٹرس وغیرہ جیسی جدید سہولیات سے

کالونی بھری پڑی تھی۔ ان تمام خارجی سہولیات کے باجود کالونی کی داخلی زندگی سکون سے خالی نظر آرہی تھی۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد جب کوئی انسان رات کو سونے کے لئے بستر پر لیٹ جاتا تو وہ صرف اپنی آنکھیں بند کر سکتا تھا۔ دماغ کو راحت دینے کے لئے اُسے نیند کی گولیوں کو سہارا لینا پڑتا۔ ہر شخص کے خیالات کی نازک کشتی ٹینشن کے گہرے سمندر میں ڈوبتی ہی چلی جاتی تھی۔ مادّی چیزوں کو پانے کی دوڑ میں انسان کی فطرت حیوانی خصلت میں بدل گئی تھی۔ جس کی وجہ سے انسانیت پر حیوانیت کا زور بڑھتا جارہا تھا۔ کالونی کے قبرستان میں ایک بڑا پولیس اسٹیشن موجود تھا جو زندوں کو مُردوں کی ہڈیاں چبانے سے کبھی کبھی باز رکھتا تھا۔ رات کے گہرے سائے پڑتے ہی زندگی کا بازار بند ہو جاتا۔ اور ہر انسان پریشاں حالی کے بھنور میں پھنس جاتا۔ کچھ دیر کالونی کی پراسرار زندگی کے اتار چڑھاؤ پر سوچنے کے بعد وہ بڑی سنجیدگی سے نوجوان کے سوال کا جواب دینے لگا:

''بیٹا! ہمارے گاؤں میں سب کچھ قدیم ہے۔ صاف وشفاف چشمے اُبلتے ہیں، تازہ ہوا چلتی ہے، بغیر ملاوٹ کھانے کی چیزیں ملتی ہیں۔ لوگ اپنے ہاتھوں سے زراعت کماتے ہیں۔ تازہ پھل کھاتے ہیں۔ ہری ہری سبزیاں اُگتی ہیں۔ لوگ محنت کرتے ہیں، صحت مند ہوتے ہیں۔ اور سب سے اہم چیز یہ ہے کہ وہاں انسان... انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں محبت کے سمندر موجزن ہیں اور ہونٹوں پر فطری مسکراہٹ کے پھول کھلتے ہیں۔ وہاں کے ماحول میں امن وسکون کی خوشبودار مہک چھائی رہتی ہے۔''

ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ نوجوان حیرت انگیز آنکھوں سے پھیری والے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عورتیں آبدیدہ نگاہوں سے مردوں کے چہروں کو پڑھ رہی تھیں اور مرد مایوسی بھری نظروں سے بستی نُما جنگل کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

میں رات کا کھانا کھانے کے بعد جب بستر پر نیند کی تلاش کے لئے لیٹ گیا تو

نیند کے بدلے دانا پھیری والے کے دانشمندانہ خیالات اور خلوص بھرے جذبات میرے ذہن پر چھائے رہے اور میں اپنے گردونواح میں چھائے ہوئے مصنوعی ماحول کی زہرناک فضاؤں سے رہائی پانے کے بارے میں سپیدۂ سحری تک سوچتا رہا۔ نیند کا خمار جب میرے دماغ پر چڑھنے لگا تو اونگھتے اونگھتے میری آنکھ لگ گئی۔

اچانک میرے کانوں سے پھیری والے کی دردناک آواز ٹکرائی کہ ''زندگی کی سب دکانیں بند ہیں اس شہر میں۔'' میں نیند کے گہرے سمندر سے نکل کر زندگی کی کشتی کا مسافر بن گیا۔ سورج کی چمکتی کرنیں جب میری خواب گاہ میں داخل ہوئیں تو میں نیند بھری آنکھوں سے کھڑکی کھول کر سنسان گلی میں اُس آواز کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا لیکن گمشدہ آواز کا کہیں بھی پتہ نہ چل سکا۔ تمام کالونی پر تشویشناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کالونی کی کہرزدہ فضاؤں میں چیل کوّے لمبی لمبی اُڑان بھرنے میں مگن تھے۔ گھنے چنار کے ہرے پتوں پر خزاں کا سایہ پڑ چکا تھا اور بستی کا سیاہ دھواں یہ اشارہ کر رہا تھا کہ شاید اب بستی کی فضاؤں میں کسی پھیری والے کی دردناک آواز کبھی نہیں گونجے گی.. کبھی نہیں... کبھی نہیں...!

OOO

کالے دیوؤں کا سایہ

(مزاحمتی افسانہ)

غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی کالے دیوؤں کا خوفناک سایہ بستی کی خاموش فضا پر آندھی بن کر چھا جاتا اور شل زدہ ذہنوں میں ماتم کی دھنیں بجنا شروع ہو جاتیں۔ خوف کا سائرن بجتے ہی خون آلودہ دلوں کی دہشت ناک لہروں سے غمگین سوچوں میں وحشت ناک ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ معصوم بچے رات بھر ماں کی چھاتی سے لپٹے رہتے اور والدین ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹنے پر مجبور ہو جاتے۔ برفیلے پہاڑوں کے دامن میں بستی کے بیچوں بیچ کالے دیوؤں کی ویران گھاٹی کے پھاٹک کے سامنے برفیلے گالوں کے درمیان مرے ہوئے کتوں کا عفونت انگیز ڈھیر راہ چل رہے لوگوں پر وحشت طاری کر رہا تھا۔ خون میں لت پت یہ کتے اپنی عادت نہ چھوڑنے پر اپنی جان کھو بیٹھے تھے۔ رات کے اندھیرے میں جب کالے دیو بستی میں گھسنے کی کوشش کرتے تو ان کے ناپاک عزائم کو بھانپتے ہی ان بے زبانوں کا احتجاج شروع ہو جاتا۔ ان بے زبانوں کا احتجاج جب کالے دیوؤں کی ناکامی کا سبب بنتا گیا تو انہوں نے ان کتوں کو بستی والوں کے وفادار محافظ سمجھ کر انہیں ہلاک کرنے کا آپریشن شروع کر دیا اور اس بے زبان مخلوق کی نسل کشی کا سلسلہ شروع ہوا۔

کالے دیوؤں کا یہ منحوس سایہ کئی دہائیوں سے بستی پر چھایا ہوا تھا اس جنّت نُما بستی کے روح پرور مشک بار ماحول کو ان بدصورت کالے دیوؤں کی بدبودار سانسوں نے پلیگ زدہ بنائے رکھا تھا اور ان خبیث روحوں کی جابرانہ موجودگی کی وجہ سے بستی کے عنبر آگیں چمن زاروں، جُھر جُھر کرتے آبشاروں، پُرفریب کہساروں اور حُسن خیز سبزہ زاروں پر

منحوسیت کے سیاہ سائے چھائے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں یہ چنڈال فطرت بدصورت مخلوق کن بدتہذیب ویرانوں سے نکل کر ہاتھی کے دانت دکھائے بستی کے ریشم مزاج انسانوں کے سروں پر موت بن کر سوار ہو چکی تھی۔ چمنستان کے باغیرت باغبان لگاتار ان بے غیرت حملہ آوروں کو بھگانے کے وظائف پڑھتے رہتے تھے، پر بستی کا نصیب ہی جانے کہ یہ بدفطرت مخلوق وظائف کے اثر کو بے اثر بنانے کے لئے بستی کی ہی چند کالی بھیڑوں کی ناپاک نفسیات کو اپنے آسیبی حربوں سے متاثر کرتے اور وہ کم ظرف شعبدہ باز اپنے کرتبوں سے ان کی موجودگی کو دوام بخشنے کی راہیں ہموار کرنے میں اپنے کرتب دکھاتے رہتے۔

یہ بدفطرت کالے دیو بستی کے کسی بھی گھر میں بے دھڑک گھس جاتے اور اپنی خونخوار آنکھوں کا رعب جماتے ہوئے بستی کے مکینوں کی بے بسی اور بے کسی کے ساتھ جس طرح سے چاہتے کِھلی اُڑاتے رہتے۔ اگر کوئی انسان اپنی آن بچانے کے لئے ان درندوں سے اُلجھ پڑتا تو ان وحشیوں کے خونخوار پنجے اس مظلوم کو نوچ نوچ کر لہولہان کر دیتے اور ان کے معصوموں کو پلک جھپکتے ہی جھپٹ کر لے جاتے۔ بستی کے لوگ ان آدم خوروں کے بجائے ان بے زبان کتوں کی وفاداری اور انسان دوستی کے شکر گزار نظر آتے تھے۔ جورات کے گھنے سائے میں اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر بستی کے لوگوں کو بھونکتے بھونکتے ان ظالموں کی آمد کا اشارہ کرتے رہتے۔

پھاٹک کے سامنے مارے گئے کتوں کی بدبو سے جب کالے دیو تنگ آگئے تو انہوں نے بستی کے لوگوں کو حکم جابری سنایا کہ وہ ان خون آلودہ کتوں کو اپنے اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر دور کسی نالے میں پھینک دیں۔ بے بس لوگ حکم جابری کی تعمیل کرتے ہوئے کتوں کو کاندھوں پر اُٹھائے جا رہے تھے کہ اچانک مردہ کتوں کے ڈھیر میں ایک خوبصورت نوجوان کی لاش پر اُن کی نظر پڑی۔ وہ خوف زدہ ہو کر ڈھیر سے پیچھے ہٹنے لگے۔ ان کے پیچھے ہٹتے ہی کالے دیو آگ بگولہ ہو کر چلانے لگے:

''سالے...! پیچھے کیوں ہٹے..؟ ان کتوں کو جلدی یہاں سے ہٹاؤ، ہوا میں بدبو

پھیل رہی ہے۔''

''ان.. ان میں ایک انسانی لاش بھی ہے۔'' ایک نوجوان لرزتی آواز میں بولا۔

''اُس کو بھی یہاں سے دفع کرو اور ان کتوں کے ساتھ کسی نالے میں ڈال دو۔'' کالی غار سے ایک طنز آمیز آواز آئی۔

''لیکن...!''

''سوال مت کر، نہیں تو تُو بھی کُتے کی موت مرے گا.. بسالا۔'' ایک اور خوفناک آواز نوجوان کے کانوں سے ٹکرائی۔

کالے دیو جشنِ زیتون' منانے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ بستی کے بچوں کو ہدایت ملی تھی کہ وہ رنگا رنگ پروگرام بنانے کے ساتھ ساتھ 'شاخ زیتون' کے موضوع پر بھی تقریر تیار کریں۔ دوسرے نوجوانوں کے ساتھ ساتھ معصوم الوقت نے بھی پروگرام میں شرکت کرنے کا ارادہ کرلیا اور 'شاخ زیتون' کے فلسفے پر روشنی ڈالتے ہوئے تمام سامعین سے داد تحسین پائی۔ کالے دیوؤں کا رہبر بھی معصوم الوقت کے امن پسند خیالات سے خوش ہوا اور وہ اپنے امن کے مہان دیوتا کے بنائے ہوئے خوشنما سفید رنگ کبوتر، جس کی چونچ میں 'شاخ زیتون' تھی، معصوم الوقت کو انعام میں دیتے ہوئے جشنِ شاستری پڑھنے لگا:

''ہمیں بے حد خوشی ہو رہی ہے کہ بستی کے نوجوانوں میں امن کی روح جاگ اُٹھی ہے۔ اُن کی آنکھیں روشنی کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ میں آپ لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ بستی کے اندر اب کسی قسم کا کالا سایہ نظر نہیں آئے گا۔ آپ لوگ صرف اپنی بستی میں زیتون کے پیڑ اُگانے کا وعدہ کیجئے۔''

'جشنِ زیتون' ختم ہوتے ہی معصوم الوقت خوشنما سفید رنگ کبوتر کو لے کر گھر کی جانب دوڑ پڑا۔ وہ گھر والوں کو اپنے انعام کی خوشخبری سنانے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ وہ جونہی کالے دیوؤں کے پھاٹک کے قریب پہنچا تو اُسے رُکنے کی آواز سنائی دی۔ چند منٹوں کے بعد اُسے دوسرے لوگوں کے ساتھ مردہ کُتے اُٹھانے کا حکم ملا۔ اُس کے

انکار کرنے پر کالے دیوؤں کی آنکھوں میں خون پھیلنے لگا۔ اُس کے ہاتھ میں اپنے دیوتا کے خوش نما سفید رنگ کبوتر کو دیکھتے ہی ایک دیو پوچھ بیٹھا:

''یہ کبوتر تم کو کہاں سے ملا؟''

''جشنِ زیتون والے پروگرام میں شاخِ زیتون سے متعلق میری تقریر سے خوش ہو کر آپ کے رہبر نے مجھے یہ کبوتر انعام میں دیا۔'' معصوم الوقت نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ہمیں شاخِ زیتون کا فلسفہ سکھاتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے کالے دیوؤں نے اُسے مردہ کتوں کے ڈھیر پر پھینک دیا۔

''نہیں! یہ سراسر ظلم ہے۔ تمہاری اس وحشت ناک حرکت سے مہان دیوتا کے امن پسند آدیشوں کا خون ہو رہا ہے۔ آپ صفائی کرم چاریوں کی مدد سے ان کتوں کو یہاں سے ہٹا سکتے ہیں۔'' معصوم الوقت کے منہ سے شاخِ نبات کے میٹھے میٹھے الفاظ نکل رہے تھے۔

''ہمیں شانتی کا منتر سکھا رہا ہے۔ سالا۔'' ایک بدصورت دیو اُس پر اپنے خونخوار پنجوں سے وار کرتے ہوئے بول پڑا۔

معصوم الوقت کے جسم سے خون کے فوارے نکل پڑے۔ چند ہی لمحوں کے اندر اندر شاخِ نبات کی مٹھاس اُس کی شریانوں میں زہر بن کر دوڑنے لگی۔ اور مہان دیوتا کے سفید کبوتر پھڑ پھڑانے سے جھیل کا نیلا پانی سرخ مائل ہوتا گیا۔ کالے بادلوں کی خوفناک بجلیاں چارسو گرجنے لگیں۔ بے بس مخلوق بدحواسی کے عالم میں خون آلودہ کتوں کے ساتھ ساتھ معصوم الوقت کی خون ٹپکتی لاش کو بھی اپنے ناتواں کندھوں پر اُٹھائے جا رہے تھے اور کالی آندھی ان کے شل زدہ کانوں کو کالے دیوؤں کے سرہنگ کا قومی پیغام سُنا رہی تھی:

''اگر جنّت کے وارثین، اپنے بچوں کے ہاتھوں میں شاخِ زیتون تھما دیں گے تو انہیں شاخِ نبات سے نوازا جائے گا۔''

○○○

گمشدہ قبرستان

(مزاحمتی افسانہ)

غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی اُس کی نظریں مشرقی پہاڑی والے درّے پر جم جاتی تھیں۔ کالی رات کے سیاہ سائے پھیلنے کے ساتھ ساتھ اُس کی نظروں کے سامنے مایوسی کا غبار چھا جاتا اور وہ کھڑکی بند کر کے فریم میں مقید مسکراتے فوٹو کو اپنے سینے سے لگا کر زار و قطار رونا شروع کر دیتی۔ جدائی کے کربناک لمحوں کے درمیان، رات کے سناٹے میں پہاڑی درّے سے صرف ایک ہی دردناک آواز اُس کے کانوں سے ٹکراتی رہتی.. میں واپس آؤں گا.. میں واپس آؤں گا..!

واپس آنے والی یہ پُراُمید آواز اب نا اُمیدی کا صحرا بن کر سلطانہ کی روح میں سراب بن کر اُتر چکی تھی کیونکہ لمحوں نے اب برسوں کا روپ دھار لیا تھا۔ وہ بیوہ کے خوفناک لفظ سے ایسے ڈرتی تھی جیسے کوئی تندرست انسان زہریلے سانپ کے ڈسنے سے ادھ مرا پڑا ہو۔ اُس کے زخمی دل کا مرہم صرف ماں کی ایک دُعا تھی.. بسدا سہاگن رہو بیٹی.. لیکن جب جدائی کے غمگین جذبات کی تیز و تند لہریں دل سے اُٹھ کر اس کی سوچ پر اثر انداز ہو جاتیں تو اعتماد کے پہاڑ میں وشواس کا آتش فشاں گرم ہو جاتا اور وہ اُمید کے بھنور میں پھنس کر سوچتی کہ وہ بیوہ ہے یا کہ سہاگن..؟

سلطانہ کا مسکن سلطان پور تھا۔ سلطان پور، وادی کا ایک خوب صورت گاؤں تھا۔ فلک بوس پہاڑوں کے درمیان واقع یہ گاؤں ایک تابناک تاریخ کا حصّہ رہا تھا۔ اس کی اپنی ایک شاندار تہذیب تھی، اپنا ایک شاندار تمدن تھا۔ زندگی کی سانسیں خوشگوار ماحول

میں چلتی تھیں۔ گاؤں کے لوگ خوشبودار فضاؤں کے آزاد پنچھی معلوم ہوتے تھے، لیکن ان آزاد پنچھیوں کی آزادی اس وقت چھن گئی جب خوشبودار فضاؤں پر سیاہ بادلوں کی کڑکتی بجلیوں نے آگ کے شعلے برسانا شروع کر دیئے۔

ہر طرف کالا دھواں پھیل گیا اور گھر گھر سے ماتم کی دھنیں بجنے لگیں۔

برسوں پہلے سلطان پور کے بلند پہاڑوں سے کالی بلاؤں کا ظہور ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان خوفناک بلاؤں نے طاقت کے بل پر سلطان پور کو اپنے خونیں شکنجے میں اس طرح سے کس لیا کہ ہنستے مسکراتے چہرے مرجھے مرجھائے سے نظر آنے لگے۔ دہشت کی وجہ سے ہر انسان نفسیاتی مریض بنتا گیا اور گلستان قبرستان بنتے گئے۔

گاؤں کے اسی پُر آشوب ماحول میں سلطانہ جوان ہوگئی۔ رشتے آنے لگے، مشورے ہوتے رہے اور آخر کار سلطانہ کا رشتہ گاؤں کے ایک ایسے خوب رو بہادر نوجوان سے طے ہوا جو نام کا ہی نہیں بلکہ دل کا بھی سلطان تھا۔ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ صالح فطرت بھی تھا اور ہر کسی کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتا تھا۔ ایک دفعہ جب گاؤں کے ایک غریب کسان کی گائے مرگئی تو غریب کسان کے گھر سے آہیں اور سسکیاں اُٹھنے لگیں۔ سلطان سے غریب کا یہ صدمہ برداشت نہ ہوا اور اُس نے گھر کی گائے بلا معاوضہ غریب کسان کو دے دی۔ کُشتی میں اُسے کوئی بھی پچھاڑ نہیں سکتا تھا اور کبڈی کے کھیل کا تو وہ چمپئن ہی تھا۔ کھیتی باڑی اُس کا پیشہ تھا۔ وہ سال بھر اپنے ہی کھیت کھلیانوں میں محنت مزدوری کر کے روزی روٹی کماتا تھا۔ گاؤں کی اکثریت بھی زراعت کے پیشے سے ہی وابستہ تھی۔ پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد اگرچہ کم تھی تاہم گاؤں کے اکثر بچے اب اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔

ایک صبح تمام گاؤں والوں کو کڑکتی سردی میں گھروں سے باہر نکالا گیا اور ایک بڑے میدان میں یخ بستہ برف کے اوپر بٹھایا گیا۔ چار جانب ہتھیار بند پھیلے ہوئے تھے۔ خوف و دہشت کی بلاؤں نے ہاہا کار مچاتے ہوئے نوجوانوں کو چن چن کر اپنی گرفت میں

لینا شروع کر دیا۔ ان کے کپڑے اُتار اُتار کر انہیں ننگے بدن پیڑوں سے باندھا گیا۔ ٹار چر شروع ہو گیا۔ چیخ و پکار سے پیڑوں پر بیٹھے پرندے بھی سہم گئے۔ سلطان کو بھی پیڑ پر اُلٹا لٹکا یا گیا اور درجن بھر بندوق بردار اُس پر ٹوٹ پڑے۔ گاؤں کے بے گناہ نوجوانوں کو بے رحمی سے مارتے دیکھ کر گاؤں والے شور مچانے لگے۔ جرأت کا مظاہرہ کر کے سلطانہ اندھی بندوق کے سامنے کھڑی ہو گئی اور ظالموں کے ہاتھوں سے سلطان کو چھڑوانے کی کوشش کرنے لگی۔ کمانڈر نے رُعب دار آواز میں اسے پیچھے ہٹنے کو کہا۔

''آپ لوگ بندوق کا رعب جما کر انہیں کیوں ظلم کا نشانہ بنا رہے ہیں۔'' سلطانہ احتجاج کرتے ہوئے بول پڑی۔

''ہمیں اطلاع ملی ہے کہ گاؤں کے نوجوان دہشت گردوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔''

''دہشت گرد.. کون..؟'' سلطانہ کا پارا چڑھنے لگا ''جو طاقت کے بل بوتے پر گھسیٹ کر ہمیں یہاں لائے۔''

''ہمارے کام میں دخل مت دو۔'' کمانڈر نے گالی دیتے ہوئے اُسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔ سلطانہ نے بھی جذبات میں آکر اُس کے منہ پر کرارا تھپڑ مارا۔ لوگ بھی زوردار احتجاج کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے اور بندوق بردار گرم ماحول دیکھ کر وہاں سے فرار ہو گئے۔

شادی کا دن تھا۔ سلطانہ کو بڑے دھوم دھام سے سُسرال لایا گیا۔ نصف رات کے وقت اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور آناً فاناً نقاب پوش افراد کی ایک ٹولی گھر کے اندر گھس گئی۔ سلطان کے ساتھ ساتھ دوسرے افرادِ خانہ کو بھی بندوق کی نوک پر گھر سے باہر نکالا گیا۔ سلطانہ کو کمرے میں ہی بند کر دیا گیا۔ سلطان کے ہاتھ رسیوں سے باندھے گئے۔ ہر طرف خوف کے سائے منڈلانے لگے۔ سیاہ بادلوں کی کڑکتی بجلی نے پھولوں کی سیج کو بھسم کر ڈالا۔ جمہوریت کے ایوان ہلنے لگے۔ وحشی کی جھپٹ سے مظلوم ہرن کی درد

انگیز چیخ اندھیرے میں گونج اُٹھی۔ سلطان ظالموں کے شکنجے کو توڑ کر کمرے کی طرف دوڑ پڑا۔ سلطانہ بستر پر بے حس پڑی تھی۔ سلطان نے درندے کے ہاتھ سے بندوق چھینی اور گردن پکڑ کر اُسے گھسیٹتے ہوئے مکان سے باہر لایا۔ نقاب پوش سلطان پر ٹوٹ پڑے اور اسے زنجیروں میں جکڑ کر پہاڑی کی اور چل پڑے۔ سلطانہ ٹوٹے قدموں سے کھڑکی پر کھڑی ہوگئی۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پہاڑی درّے سے صرف ایک آواز آرہی تھی، سلطانہ میں واپس آوں گا.. میں واپس آوں گا۔

گزرتے وقت کے کرب انگیز لمحوں نے سلطانہ کے دل و دماغ کو شل کر کے رکھ دیا تھا۔ امید کے ہرے بھرے پتے زرد ہوتے جا رہے تھے۔ عید کا چاند نکل آیا تھا۔ خوشی کے ان لمحات میں بھی سلطانہ کی سوچ پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ رات کا کھانا کھانے کے ساتھ ہی وہ بستر پر لیٹ گئی۔ آنکھ لگتے ہی اُسے خواب میں سطان نظر آیا جو بانہیں پھیلا پھیلا کر کہہ رہا تھا: ''سطانہ کل مجھ سے ملنے آنا.. ہم پھر سے ملیں گے۔ اب ہمیں کوئی ظالم جُدا نہیں کر سکتا۔''

سلطانہ کی نیند اچانک ٹوٹ گئی۔ وہ کھڑکی کھول کر پہاڑ کی طرف دیکھنے لگی۔ وہاں صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ وہ مایوس ہو کر دوبارہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے آنکھیں تو بند کر لیں لیکن نیند کوسوں دور بھاگ چکی تھی۔ صبح تک اس کی آنکھوں میں عجیب وغریب مناظر آتے رہے۔ عید کی گہما گہمی چارسو پھیلی ہوئی تھی۔ سلطانہ کے قدم نہ چاہتے ہوئے بھی قبرستان کی جانب بڑھنے لگے۔ قبرستان پچھلی دو دہائیوں سے سینکڑوں مظلوموں کو اپنی گود میں سُلاتا آیا تھا۔ قبرستان پہنچ کر سلطانہ کو ایک سبز رنگ کا کتبہ نظر آیا۔ کتبے پر ''گمشدہ قبرستان'' لکھا ہوا تھا۔ یہاں کشمیر کی گمشدہ نسل دفن تھی۔ گمشدہ قبرستان ایسی ہزاروں گمنام قبروں کا مسکن تھا جس میں عدمِ تشدد کا فلسفہ جمہوریت کا کفن اوڑھے ہوئے دفن تھا۔ قبرستان مظلوموں کی آہوں اور سسکیوں سے ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ کوئی ماں اپنے گمشدہ بیٹے کو ڈھونڈ رہی تھی اور کوئی معصوم بچہ اپنے گمشدہ باپ کی قبر تلاش کر رہا تھا، لیکن کسی کے ہاتھ مایوسی کے سوا کچھ بھی نہ آتا تھا۔ چارسو حشر کا سماں بپا تھا۔ اس حشر نما عالم میں سلطانہ کے ٹوٹے

قدم ایک گمنام قبر کے نزدیک خود بہ خود رُک گئے۔ وہ قبر کو غور سے دیکھنے لگی۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ قبر اس سے کہہ رہی ہے کہ سلطانہ تیرا سلطان میری گود میں سو رہا ہے۔ ظالموں نے اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے میرے حوالے کر دیا تھا۔ سلطانہ لرزتے وجود کے ساتھ وہاں سے چیختی چلاتی گھر کی جانب دوڑ پڑی نہیں ایسا نہیں ہوسکتا.. ایسا نہیں ہوسکتا..! کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے سلطان کا فوٹو سینے سے لگایا اور خون کے آنسو بہانے لگی۔

رات کے سیاہ سائے چھانے لگے۔ ہتھیاروں سے لیس درجن بھر نقاب پوش گھر کے اندر نمودار ہوئے۔ گھر میں سناٹا چھا گیا۔ خوف کے مارے سلطانہ کا دل بیٹھنے لگا۔

''تم نے ہمارے خلاف کیوں ہیومن رائٹس کمیشن میں کیس دائر کیا ہے؟''

کالا افسر دانت دکھاتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

''کہاں ہے میر اسلطان؟'' سلطانہ سہمی سہمی آواز میں بول پڑی ''مجھے میرا سلطان لوٹا دو۔''

''وہ دہشت گردوں کے ساتھ کام کرتا ہے۔'' وہ پھنکارتے ہوئے بول پڑا۔ ''تم اس کاغذ پر انگوٹھا لگاؤ۔''

''مجھے میرا سلطان واپس لا کر دو۔'' سلطانہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار نکل پڑی ''تب ہی میں سفید کاغذ پر انگوٹھا لگاؤں گی۔''

ظلم کی ننگی تلوار ہوا میں رقص کرنے لگی۔ سلطانہ کے دل سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ سرخ خون سے سفید کاغذ پر انگوٹھا لگ گیا۔ جدائی کی آخری سانسیں دم توڑنے لگیں۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے کھڑکی کے پٹ کُھل گئے۔ سلطان پور کے گھر گھر سے ماتم کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ کالی بلاؤں کے خونیں پنجوں نے گلستان کے رنگ برنگے پھولوں کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ چھوڑا اور سلطانہ کی آس بھری نظریں پہاڑی کے اُس درّے پر جم چکی تھیں جہاں بھیانک اندھیرا تھا... صرف بھیانک اندھیرا!

OOO

ناقوس واذان

اسکول جاتے ہوئے ماسٹر گاش لال کی نظر غنی چاچا پر پڑی ۔غنی چاچا اپنے چھوٹے بیٹے احمد کو سمجھا رہا تھا کہ بڑی ہوشیاری سے بھیڑوں کی رکھوالی کرنا' کہیں کسی کے کھیت کا نقصان نہ ہونے پائے اور شام کے وقت انہیں گن کر گھر واپس لانا۔ ماسٹر گاش لال یہ سُن کر غنی چاچا کو اپنے ساتھ نزدیکی اسکول تک لے گیا اور غنی چاچا کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہنے لگا:

''غنی چاچا..! یہ اسکول سرکار نے آپ کے بچوں کے لئے کھولا ہے تاکہ آپ کے بچے تعلیم کے نور سے آراستہ ہو جائیں۔ آپ کا چھوٹا بیٹا احمد بھی کل تک اسکول آتا تھا اور آج آپ نے اُسے بھیڑ بکریوں کی رکھوالی پر مامور کیا۔''

''ماسٹر جی۔'' غنی چاچا ادب کے ساتھ بول پڑا ''مجھے بھی احمد کو پڑھانے کا شوق ہے لیکن ماسٹر اکرم صاحب نے مجھ سے کہا کہ احمد ذرا کُند ذہن ہے، اُس کو سبق یاد نہیں رہتا ہے، بہتر یہی ہے کہ آپ اُسے کسی کام دھندے میں لگا دو۔''

''احمد کُند ذہن نہیں ہے۔' گاش لال احمد کی تعریف کرتے ہوئے کہنے لگا ''وہ بڑا ذہین بچہ ہے۔ اُسے کل دوبارہ اسکول بھیجنا۔''

''نہیں، ماسٹر جی'۔ غنی چاچا کرسی سے اُٹھتے ہوئے بول پڑا۔ ''احمد اب بھیڑ بکریوں کی رکھوالی ہی کرے گا۔''

''نیچے بیٹھو۔'' گاش لال تند لہجے میں بول پڑا۔ ''آپ مسلمان ہیں اور میں ایک

پنڈت ہوں۔ آپ کا قرآن شریف 'اقراء' کی تعلیم دیتا ہے یعنی پڑھو اور آپ مسلمان ہونے کے باوجود قرآن شریف کے حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔''

''لیکن ماسٹر اکرم...''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' گاش لال نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا'' کل احمد کو پھر سے اسکول بھیجنا۔''

غنی چاچا کھیت کی طرف چلا گیا۔ ہل جوتتے ہوئے اُس کے ذہن میں بار بار ماسٹر گاش لال کی 'اقراء' والی بات آتی رہی۔ وہ واپس گھر آیا اور احمد کا اسکولی بیگ ہاتھ میں اُٹھا کر بھیڑوں کے ریوڑ کی طرف چلا گیا اور احمد کو ساتھ لے کر اُسی دن اسکول پہنچ گیا۔ ماسٹر گاش لال یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ احمد بھی خوشی کے ساتھ کلاس میں چلا گیا۔

''میرے پاس اس وقت فیس نہیں ہے۔'' غنی چاچا نے ماسٹر گاش لال سے کہا۔ ''لیکن چند دنوں کے اندر اندر میں ضرور فیس بھیج دوں گا۔''

''فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔'' گاش لال ایڈمیشن رجسٹر پر احمد کو درج کرتے ہوئے بولا۔''میں اپنی جیب سے اُس کی فیس ادا کر دوں گا لیکن تمہیں اُس کو ہمیشہ وقت پر اسکول بھیجنا ہوگا۔''

غنی چاچا، ماسٹر گاش لال کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے چل پڑا۔

یہ ایک خوشحال بستی تھی، جس کی تاریخ صدیوں کے آپسی بھائی چارے اور انسانی قدروں کے پاسدار اُصولوں پر مبنی تھی۔ بستی کے بیچوں بیچ' وقت کی سرد و گرم ہواؤں سے بے نیاز ایک سبک رفتار کشادہ ندی قرنوں سے اپنی گود میں برفیلے پانی کے میٹھے خزانے سمائے ہوئے رواں دواں تھی۔ ندی کے ایک طرف کثیر تعداد میں مسلمان آباد تھے اور دوسری جانب پنڈتوں کی قدرے قلیل آبادی موجود تھی۔ مسلمانوں کی اکثریت ان پڑھ تھی۔ اور زیادہ تر اپنے کھیت کھلیانوں میں ہی کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے۔ پنڈت برادری زیادہ تر پڑھے لکھے لوگوں پر مشتمل تھی۔ ان میں اکثر سرکاری ملازم تھے۔ ندی

کے صاف وشفاف پانی کی تاثیر نے بستی کی فطرت میں شیر وشکر والی مٹھاس گھول دی تھی۔ پیار ومحبت دونوں فرقوں کی مشترکہ میراث تھی اور ایک دوسرے کے غم وخوشی میں یہ لوگ بلا تفریق مذہب وملت پیش پیش ہوتے تھے۔ مسلمانوں کی مسجد سے جب صبح کی اذان فضا میں گونجتی تو مندر سے بھی ناقوس کی صدا بلند ہوتی تھی۔ پرندے دونوں آوازوں کو سن کر پیڑوں پر خوشی سے چہچہانا شروع کر دیتے تھے۔ ندی کے تیز رو پانی سے مسلمان صبح کی نماز کے لئے وضو بناتے تھے اور ہندو بھی پوجا پاٹھ کے لئے اشنان کرتے تھے۔ دونوں فرقوں کی عورتیں صفائی پکائی کے لئے مٹکوں میں پانی بھر بھر کر ہنستے مسکراتے ایک دوسرے کا حال چال پوچھتی رہتی تھیں۔ ماسٹر گاش لال اور غنی چاچا اس بستی کے پشتینی باشندے تھے۔

بستی میں اگر کبھی کبھار کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا تو یہ دونوں پہل کر کے صورتحال کو سنبھالنے کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور نکال لیتے۔ دونوں کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ بستی کا کوئی بھی پیچیدہ مسئلہ دوراندیشی سے حل کر دیتے تھے۔

بستی کے لوگ روایتی انداز میں سوچنے کے قائل تھے۔ خورد ونوش کا سارا انحصار کھیت کھلیانوں پر تھا اس لئے وہ بڑی سادگی کے ساتھ اپنے بچوں کو پڑھنے پڑھانے کے برعکس کھیتی باڑی کے کاموں کی ترغیب دیتے تھے۔ گاش لال ایک سینئر ماسٹر تھا۔ وہ ہمیشہ وقت پر اسکول جایا کرتا تھا اور چھٹی کے بعد بستی والوں کو وقتاً فوقتاً تعلیم کی اہمیت سمجھاتے ہوئے انہیں اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے پر آمادہ کرنے کی کوشش بھی کرتا رہتا۔ ایک دن ماسٹر گاش لال نصف دن کی رخصت کے بعد اسکول کی طرف جا رہا تھا۔ اُس نے راستے میں احمد کو اسکولی بیگ لئے روتے بلکتے ہوئے دیکھا۔ نزدیک پہنچ کر وہ احمد سے پوچھنے لگا کہ وہ اسکول چھوڑ کر کہاں جا رہا ہے۔ احمد ہچکیاں لیتے ہوئے کہنے لگا کہ ماسٹر اکرم صاحب نے اُسے بہت پیٹا اور اسکول سے نکال دیا۔ گاش لال اُسے بازو پکڑ کر واپس اسکول لے گیا۔ اسکول پہنچ کر وہ ماسٹر اکرم کی کلاس میں چلا گیا اور احمد کو کلاس

میں بٹھاتے ہوئے اکرم صاحب سے پوچھ بیٹھا:

''آپ نے احمد کو کیوں کلاس سے نکال دیا؟''

''اس کے پاس کبھی بھی کاپی نہیں ہوتی ہے۔'' ماسٹر اکرم نے ناگواری سے جواب دیا۔

''اُس کے باپ کو بتا دیں گے، وہ کاپی لے آئے گا۔'' گاش لال نے نرم لہجے میں کہا۔''اس بات پر بچے کی پٹائی کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔''

''یہ میری کلاس ہے۔'' ماسٹر اکرم تند لہجے میں بولا''اور اس میں کسی کو داخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''مداخلت کی بات نہیں ہے۔ یہ فرض کا معاملہ ہے اور اس کے لئے ہم تنخواہ لیتے ہیں ہم تعصب سے کام لے کر کسی کو تعلیم کے نور سے محروم کیوں کریں۔ پڑھانا ہمارا پیشہ ہے۔ تعلیم کا پیشہ پیغمبروں کا پیشہ ہے، اس کے ساتھ انصاف کرو۔''

''اچھا۔'' اب مجھے ایک پنڈت سے دین سیکھنا پڑے گا؟'' ماسٹر اکرم آپے سے باہر ہو گیا۔

''اپنے آپ کو بڑا مسلمان سمجھتا ہے؟'' ماسٹر گاش لال کو بھی غصہ چڑھ گیا''تم ان معصوموں کو ان پڑھ رکھنا چاہتے ہو تا کہ ان کی زندگیاں صرف دوسروں کا بوجھ اُٹھانے تک ہی محدود رہیں، تمہارے کام سے شیطان بھی شرمائے۔''

کافی تُو تکار کے بعد ماسٹر گاش لال نے جیب سے پیسے نکال کر یہ کہتے ہوئے احمد کو دے دیئے کہ کل کاپی ساتھ لے آنا تمہیں اسکول سے کوئی نہیں نکال سکتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ احمد بھی پڑھائی میں آگے بڑھتا رہا۔ ماسٹر گاش لال نہ صرف احمد بلکہ اپنے دوسرے شاگردوں کی بھی بڑی شفقت سے رہنمائی کرتا رہتا۔ آگے چل کر اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود تمام شاگردوں کے دلوں میں اپنے شفیق استاد کا احترام موجود تھا۔ احمد پڑھ لکھ کر اُستاد بن گیا اور اپنے شاگردوں پر

اپنے شفیق استاد کی طرح ہی شفقت بکھیرنے میں بخل نہیں کرتا۔

وقت کا مزاج اچانک بدل گیا۔ بستی کے مثالی بھائی چارے پر بدامنی کے منحوس بادل چھا گئے۔ خوف و دہشت کی تُند ہوائیں گھر گھر میں پھیل گئیں۔ اندھی بندوق کا رعب چارسو چھا گیا۔ بھائی بھائی سے خوف کھانے لگا۔ پنڈت برادری کے دلوں پر خوف کا اثر کچھ زیادہ ہی پڑ گیا۔ خوف کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے سیاسی سوداگروں نے انہیں اپنے گھروں سے بے گھر ہونے پر اُکسایا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی چھپتے چھپاتے جموں کی جانب بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ ماسٹر گاش لال کے لڑکے روس میں سروس کرتے تھے۔ وہ خوف زدہ ہونے کے باوجود کسی بھی ایجنسی کے جھانسے میں نہیں آیا۔ مسلم برادری نے یہ کہتے ہوئے اُس کی ہمت بندھائی کہ وہ اس آفت کا مل جل کر مقابلہ کریں گے اس لئے وہ بستی کے مثالی چارے کو توڑ کر یہاں سے جموں نہ چلا جائے۔ گاش لال کو اپنی جنم بھومی سے محبت تھی، اپنے کشمیر سے پیار تھا، یہاں کا مثالی بھائی چارہ اُس کی روح کا حصہ بنا ہوا تھا۔ مسلم برادری کے خلوص و محبت نے اُس کے دل کو مطمئن کر دیا اور اس نے بیوی کے ساتھ اپنے اصلی گھر میں ہی قیام کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ غنی چاچا نے اپنے بیٹے احمد کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہتے ہوئے گاش لال کے ہاتھ میں تھما دیا کہ آج سے وہ احمد کو اپنا بیٹا سمجھے۔ احمد نے بھی اپنے استاد کی خبر گیری کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔

پندرہ برس گزر گئے۔ بستی کے حالات ابھی بھی کشیدہ تھے لیکن ماسٹر گاش لال کو کبھی بھی اپنے فیصلے پر پچھتاوا نہ ہوا۔ بستی کے لوگ اُس کے دُکھ سکھ میں ہمیشہ شریک رہے۔ ایک مرتبہ بستی کے لوگ نئی مسجد تعمیر کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے لیکن مناسب جگہ نہ ملنے کے باعث کچھ رکاوٹ پیش آ رہی تھی۔ باتوں باتوں میں یہ خبر ماسٹر گاش لال تک پہنچی۔ رات کو بستر پر لیٹتے ہی وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اُس کے ذہن میں بستی کے گزرے ہوئے بھائی چارے کی حسین یادیں تازہ ہو گئیں۔ اسے اپنے بیٹے جواہر لال کی شادی کا وہ دن یاد آیا جب مسلم برادری اپنے اپنے گھروں سے بھیڑ بکریاں، مرغ اور

چاول لائے تھے۔ مہمانوں کی بھرپور خاطرداری کی تھی اور مسلمان عورتوں نے پنڈت عورتوں کے سُر سے سُر ملا کر لکشمی دلہن کا دل سے سواگت کیا تھا۔

صبح ہوتے ہی ماسٹر گاش لال نے تمام مسلم برادری کو اپنے گھر بُلا لیا۔ تمام لوگ جمع ہو گئے۔ ماحول پر ایک گھمبیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سبھی سوچ رہے تھے کہ ماسٹر جی کو یہ اجلاس بُلانے کی ضرورت محسوس کیوں ہوئی؟ کہیں کوئی معاملہ تو نہیں ہوا ہے اور بستی کو خبر نہیں۔ گاش لال نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا:

''نئی مسجد شریف بنانے کا پروگرام کہاں تک پہنچا۔''

''زمین کم ہے، ابھی فیصلہ نہیں ہو پایا۔'' غنی چاچا نے کہا۔

گاش لال نے تکئے کے پیچھے سے کاغذات کا ایک پلندہ نکال کر برادری کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' غنی چاچا نے پوچھا۔

''میری زمین کے کاغذات۔'' گاش لال نے جواب دیا ''میں چاہتا ہوں کہ میرے گاؤں کی مسجد میری زمین پر بنے۔''

گاش لال نے اپنی زمین کے کاغذات یہ کہتے ہوئے مسجد کمیٹی کے چیرمین کے حوالے کر دیئے کہ میں بلا معاوضہ اپنی زمین مسجد شریف بنوانے کے لئے آپ لوگوں کو دیتا ہوں۔ مسلم برادری کو برسوں کا پُرانا مثالی بھائی چارہ یاد آ گیا اور تمام لوگوں کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔

چند برس اور بیت گئے۔ سرما کا موسم تھا۔ ماسٹر گاش لال سخت بیمار پڑ گیا۔ بستی کے لوگ رات دن اُس کی خبر گیری کرتے رہے۔ علاج معالجہ ہوتا رہا لیکن گاش لال کی حالت روز بروز بگڑتی گئی۔ اُسے جب یقین ہو گیا کہ زندگی کا آخری وقت آ گیا تو اُس نے احمد کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر یہ کہتے ہوئے آخری سانس لی کہ وہ اس کی چتا کو بڑے لڑکے کی طرح آگ لگائے گا۔ تمام لوگ دہاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ سڑکوں پر چار

پانچ فٹ برف جمی ہوئی تھی۔ راستہ بند ہونے کی وجہ سے ماسٹر گاش لال کے رشتہ دار جموں سے کشمیر نہ آسکے۔ مسلم برادری نے ہندو رسم کے مطابق گاش لال کی لاش کو نہلا دُھلا کر کفن پہنایا۔ ماسٹر گاش لال کے دوسرے شاگردوں نے اپنے شفیق اُستاد کی ارتھی کو کاندھوں پر اُٹھا کر شمشان گھاٹ پہنچادیا اور احمد گنگا جل کی مٹکی اُٹھائے آگے آگے چلتا رہا۔ ماسٹر گاش لال کے ایک شاگرد نے ناقوس بجایا اور احمد نے چتا کو آگ لگا کر بڑے بیٹے کا حق ادا کیا۔ بستی کی فضا پر سوگ کا ماحول چھایا رہا۔ چند روز کے اندر اندر مسلم برادری نے شمشان گھاٹ میں ماسٹر گاش لال کی سمادھی بناڈالی۔ سمادھی کو پھولوں سے سجایا گیا اور اس پر سنگ مرمر کا ایک پتھر رکھا گیا جس پر لکھا تھا:

''ناقوس واذان کا حقیقی پرستار...''

ooo

مشنِ القُدس

(مزاحمتی افسانہ)

ہوش میں آتے ہی اُس نے اپنی نظریں چہار جانب گھمائیں۔ اپنے اردگرد ہتھیار بند افراد دیکھ کر وہ گھبرا سا گیا۔ وہ بیڈ سے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اُٹھ نہ سکا۔ وہ اپنے اردگرد انجانے چہروں کو غور سے دیکھنے لگا۔

انجانے چہروں کے حُلیے نے اس پر وحشت طاری کردی۔ اُس کی تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔ ایک آدمی اُس کے سامنے دودھ کا گلاس رکھ کر کمانڈر کے پاس چلا گیا۔ کمانڈر کا بارعب چہرہ دیکھتے ہی اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ کمانڈر اُس کے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اور دودھ کا گلاس ہاتھ میں اُٹھا کر اُسے پلانے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر اُسے تھوڑا سا اطمینان تو ہوا لیکن دل اندر ہی اندر سے ڈوبتا جارہا تھا۔

"آپ کا نام ڈیوڈ ہے۔" کمانڈر نے مسکراتے ہوئے پوچھا "اور آپ ہمارے ملک میں ایک خفیہ مشن پر مامور ہو۔"

کمانڈر کی غیر متوقع معلومات جان کر وہ حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگیا۔

"گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں"۔ کمانڈر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بول پڑا۔ "آپ اس وقت ہمارے مہمان ہیں اور مہمان کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھنا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔"

کمانڈر کی تسلی بخش باتیں سُن کر اُسے یک گونہ اطمینان ہوا اور اُس نے کمانڈر کی طرف ہاتھ بڑھا کر شکریہ ادا کیا۔ کمانڈر بیڈ سے اُٹھ کر نماز پڑھنے کی تیاری کرنے لگا۔

تمام لوگ اکٹھا ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ نماز ادا کرنے کے بعد کمانڈر مجاہدین سے مخاطب ہوا۔

''ہم مجاہدین ہیں۔ ہمارا مقصد دنیا میں امن وامان قائم کرنا ہے۔ ظالموں کو سزا دے کر مظلوموں کو انصاف دلانا ہے، ہم مقدس جہاد کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاتھوں کوئی بھی بے گناہ انسان قتل نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں صرف ان لوگوں کے ساتھ لڑنا ہے جو ہمارے خلاف سازشیں رچا رہے ہیں اور جو ہمیں اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں۔ ہمیں کسی مذہب کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے، ہم چاہتے ہیں کہ دنیا کے تمام لوگ آزادی کے ساتھ باعزت زندگی گزار سکیں، چاہئے ان کا کوئی بھی ملک ہو یا وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔''

کمانڈر کا خطاب سُن کر ڈیوڈ کا سر چکرانے لگا۔ حقیقت نے اس کے شبہات کو صاف کر دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ میں اس وقت ان لوگوں کا دشمن ہوں اور انہوں نے مجھے میری تکلیف میں ہر طرح کا خیال رکھا۔ میری اصلیت جاننے کے باوجود بھی یہ لوگ میرے ساتھ انسانیت سے پیش آ رہے ہیں۔ یہ تو انسانیت کے سپاہی نظر آ رہے ہیں پھر ہم انہیں دہشت گرد کی گالی کیوں دیتے ہیں۔

ڈیوڈ ایک سخت گیر یہودی تھا۔ وہ اُس ملک میں 'مشنِ القدس' کے ایک خفیہ ایجنٹ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ایک دن اس کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ بُری طرح زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ مجاہدین اُسے زخمی حالت میں اُٹھا کر اپنے ٹھکانے پر لے گئے۔ آپریشن کے دوران انہیں شناختی کارڈ سے پتہ چلا کہ وہ مشن القدس کا ایک خفیہ ایجنٹ ہے جو اس ملک میں مجاہدین کا دوست نُما دشمن بن کر سازش کرنے کے لئے آیا ہوا ہے۔ چند مہینے مجاہدین کی نگرانی میں رہ کر وہ جب صحت یاب ہوا تو اُسے اپنے ملک واپس چلے جانے کا حکم ملا۔ وہ اپنے ملک واپس تو لوٹا لیکن اب مجاہدین کے اچھے برتاؤ اور انسانیت پرستانہ مقاصد نے اُسے ایک نئی سوچ عطا کی تھی۔ اُسے اپنے مشن پر ندامت ہو رہی تھی۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی انسانیت کا سپاہی بن جائے۔ ایک دن اُسے جب اپنے کمانڈر کا مسیج مل گیا تو اُس نے 'مشن القدس' کا وِیڈیو آن کیا۔

''یہ گیم کھیلنے سے ہمیں کیا فائدہ ملے گا، سر۔'' جوزی نے دھیمی آواز میں کمانڈر سے سوال کیا۔

''آپ ہماری عالمگیر ایجنسی کی ایک نئی ممبر ہیں، جوزی۔'' کمانڈر اسے سمجھاتے ہوئے بولا ''جونیئر ہونے کی وجہ سے آپ کا تجربہ بھی ابھی کم ہے اس لئے اپنے مائنڈ کو صرف سننے کی حد تک ہی محدود رکھو۔''

''ایکس کیوزمی سر...! جوزی کا سوال بڑا اہم ہے۔'' ڈیوڈ نے بڑے مہذبانہ انداز سے پوچھا۔ ''جس مشن کا منصوبہ آپ بنا رہے ہیں یہ کوئی آسان مشن نہیں لگ رہا ہے۔''

''یو آر رائٹ مسٹر ڈیوڈ۔'' کمانڈر نے اسٹک سے ڈیوڈ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس مشن کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ دو تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ پیدا کرنے کا مشن ہے۔''

''لیکن اس سے تہذیبی تصادم کی ایک نئی جنگ کا آغاز ہوگا۔'' ہین ٹیگسن کرسی سے اُٹھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

''مسٹر ہین ٹیگسن۔'' کمانڈر خوش ہو کر اُس سے مخاطب ہوا ''میں آپ کی سوچ کی داد دیتا ہوں، اس لئے آپ کو بڑی ذمہ داری کا کام سونپ رہا ہوں۔''

''تھینک یو سر۔'' ہین ٹیگسن نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''پر وہ کون سا اہم کام ہے سر۔''

''مسٹر ہین ٹیگسن۔ آپ ہمارے خفیہ گروپ کے ایک باشعور سینئر ممبر ہیں۔'' کمانڈر میٹنگ ہال میں چہل قدمی کرتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے بولنے لگا۔ ''آپ دونسلوں کی نفسیات کا فائدہ اُٹھا کر ایک ایسی مشکوک کتاب لکھیں گے جو دنیا کے انٹلیکچول مائنڈز کو بہت جلد اپنے میسج سے متاثر کرے گی۔''

''تو مجھے اس نفسیاتی بم (سائیکولوجیکل بم) کو لوجیکل کیمسٹری کی تکنیک سے تیار کرنا ہوگا۔'' ہین ٹیگسن کمانڈر کی تجویز سُن کر بول پڑا۔

''یس، یس .. میرے پلان ماسٹر۔'' کمانڈر جوشیلے انداز میں ہین ٹیگسن کو شاباشی دیتے ہوئے بولا۔

''او کے سر۔'' ڈیوڈ استفہامیہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''پلیز ہمیں اس مشن کی وجوہات اور مقاصد سے آگاہ کریں۔''

''ڈیئر فرینڈس۔'' کمانڈر اپنی صدارتی کرسی پر بیٹھتے ہوئے خطاب کرنے لگا۔

''اس مشن کا مقصد ہماری نسل کی سُپر میسی اور خود اعتمادی کو بحال کرنا ہے۔ اپنی مقدس سرزمین کو غیروں سے پاک کرانا ہے۔ ہم اعلیٰ نسل کے وارث ہیں لیکن اعلیٰ نسل ہونے کے باوجود ہمیں دوسری کم تر نسلوں کے رحم وکرم پر زندہ رہنا پڑتا ہے۔ یہ تہذیبیں ہماری تہذیب کے بعد وجود میں آئیں لیکن اپنے پاور کے بل بوتے پر انہوں نے ہمیں خانہ بدوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور کردیا۔ ہمیں اب اپنا مستقل ٹھکانہ چاہیے، یہ تبھی ممکن ہے جب ہم ان دونسلوں کو اپنے خفیہ سازشی نیٹ ورک کے کنٹرول میں لائیں گے۔''

''بہت خوب سر۔'' جوزی بے تابی کے ساتھ بول پڑی ''مشن کا مقصد تو سمجھ میں آگیا۔ اب مشن چلانے کے بارے میں بھی ہمیں بتائیے۔''

''ویل جوزی۔'' کمانڈر نے پلان کے بارے میں جانکاری دیتے ہوئے کہا۔

''مشن کے مطابق ان دونسلوں کے الگ الگ نام رہیں گے، سفید کرگس اور شاہین صفت کبوتر۔ جوزی.. تمہارے گروپ پر یہ ذمہ داری رہے گی کہ وہ سفید کرگسوں کے پاور کو شاہین صفت کبوتر مزاج نسل کے خلاف استعمال کرنے کا راستہ ہموار کریں گے اور ڈیوڈ کے گروپ کا کام شاہین صفت کبوتر مزاج نسل کے جذبات کا فائدہ اُٹھا کر انہیں سفید کرگسوں کی بالادستی کے خلاف استعمال کرنے کا ہے۔ اس خفیہ مشن کا نام رہے گا۔ ''مشنِ القُدس۔''

مشنِ القدس نے اپنا سازشی منصوبہ بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے شروع کیا۔ چند ہی برسوں کے اندر اندر انہوں نے دونوں نسلوں کی نفسیات کو اپنے کنٹرول میں کرلیا۔ دونوں نسلیں نفسیاتی جنگ کی شکار ہوگئیں۔ ڈیوڈ کا گروپ، شاہین صفت کبوتر مزاج نسل کی جذباتی سوچ کو استعمال میں لایا اور سفید کرگسوں کے ہمالیہ نما مضبوط ٹھکانوں کو آگ کے شعلوں میں تبدیل کروادیا۔

دوسری جانب جوزی گروپ نے سفید کرگسوں کی بالادست نفسیات کو بھڑکایا اور انہیں شاہینوں سے بدلا لینے پر اُکسایا۔ سفید کرگسوں نے شاہینوں کے چمنستانوں پر قیامت برپا کردی۔ لاکھوں شاہینوں کے گرم گرم خون سے سارے چمنستان لال ہوتے چلے گئے۔ ہر ذہن پر خوف کے سائے منڈلانے لگے۔

مشن القدس چلانے والے چند برسوں تک اپنی کامیابی کے خواب دیکھتے رہے لیکن دھیرے دھیرے انہیں اپنے خواب سراب ہوتے دکھائی دینے لگے۔

دنیا کے یہ خونیں مناظر ڈیوڈ کے ضمیر پر کوڑے برسانے لگے۔ وہ دوسروں کے ساتھ ساتھ خود کو بھی اس حیوانی کھیل کا ذمہ دار ٹھہراتا رہا۔ آخر کار اُس نے مشن القدس سے بغاوت کرکے انسانیت کا ساتھ دینا مناسب سمجھا۔ وہ عالمی ایوانوں تک انسانیت کی آواز پہنچانے کا عزم کرکے اُٹھا اور دنیا میں امن و آشتی پھیلانے کی زوردار مہم شروع کی، لیکن اندھیرا بہت بڑھ چکا تھا اور سفید کرگسوں نے ساری فضا میں ادھم مچا رکھا تھا۔ مشن القدس نے شاہینوں کی بلند پروازی پر مثبت اثر ڈالا۔ ان میں بکھراؤ کے بدلے اتحاد کی فضا پھیل گئی۔ ان کی اڑانوں سے دنیا کا چپہ چپہ لرزنے لگا۔ ان کی زوردار پروازوں سے مشن القدس کے سازشی ذہن نفسیاتی دباؤ کے شکار ہوگئے اور سفید کرگس بچاؤ کے راستے تلاش کرنے لگے۔ مشن امن کا چرچا ہر طرف ہو رہا تھا اور جدید دنیا کی ایک نئی تاریخ رقم ہو رہی تھی۔

○○○

دوشالہ

خوجہ کاک کی اُمیدوں پر جیسے اُوس پڑی ہوئی تھی۔ ریشم خانہ چلانے کے لئے ایک تجربہ کار کاریگر کی ضرورت ہوتی ہے اور کوئی ڈھنگ کا کاریگر نہ ملنا خوجہ کاک کے لئے سوہانِ روح ثابت ہو رہا تھا۔ اُس کی حسرت بھری آنکھیں کارخانے کی بے کار مشینوں کو تکتے تکتے پتھرا سی گئی تھیں۔ چار کمروں والا معمولی سا مکان تک گروی رکھ کر اُس نے بنک سے جو قرضہ لیا تھا، سال بھر بیت جانے کے باوجود بھی وہ بنک کے قرضہ کا ایک فیصد بھی ادا نہ کر پایا تھا۔ دوسرے مل مالکوں کی کامیابی کے مقابلے میں اپنی تجارت کی ناکامی نے اُس کے ذہن میں ایک ایسا تناؤ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اکثر بیوی بچوں کے ساتھ فضول میں لڑتا جھگڑتا اور کبھی کبھی خودکشی کرنے کے بُرے خیالات بھی اُس کی سوچ کو گھیر لیتے۔ جو بھی بیوپاری ایک مرتبہ اُس کے کارخانے سے مال خرید لیتا تو نفع کے برعکس نقصان اُٹھانے کی وجہ سے وہ دوبارہ اُس کے کارخانے کا منہ تک دیکھنا گوارا نہ کرتا۔ کافی عرصہ بیت جانے کے بعد جب ایک دن بنک کے کرمچاری پولیس لے کر خوجہ کاک کے گھر میں نمودار ہوئے اور اُسے بیوی بچوں سمیت گھر سے بے دخل کرنے لگے تو یہ خبر سنتے ہی بستی کے لوگ وہاں پر جمع ہو گئے۔ کافی منت ساجت کرنے کے بعد بستی کا ایک غریب ہمدرد شخص ریشم چاچا بنک کرمچاریوں سے چند مہینے کی مہلت مانگنے پر راضی کر گیا۔ آفت تو ٹل گئی لیکن خوجہ کاک گھر کی دہلیز پر غمگین صورت بنائے سر جھکا کر اپنی قسمت کو کوسنے لگا۔ ریشم چاچا ہمت بندھاتے ہوئے اُسے ہاتھ پکڑ کر کارخانے کی جانب

لے گیا۔ ریشم چاچا کارخانے کا بغور مشاہدہ کر کے بول پڑا۔

''خوجہ کاک! آپ نے فضول میں پریشانی کو گلے لگایا ہے، خدا پر بھروسہ رکھو وہ سب کچھ ٹھیک کر دے گا۔''

''بھروسہ تو خدا پر ہی ہے۔'' خوجہ کاک سرد آہ بھرتے ہوئے بولا ''لیکن کارخانے کی ناکامی نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔''

''کوئی بات نہیں''۔ ریشم چاچا اُس کے کندھوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگا ''اگر خدا نے چاہا تو تیرا کارخانہ دن دُگنی رات چُوگنی ترقی کرے گا۔''

''لیکن وہ کیسے..؟'' خوجہ کاک نے ریشم چاچا کا منہ تکتے ہوئے پوچھا۔

''تم صرف ایک کام کرو''۔ ریشم چاچا نے اُسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''کل کارخانے کی صفائی سُتھرائی کرانا اور دس دنوں میں ریشم منگوالینا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن...!''

''میں تیری بات سمجھتا ہوں۔'' ریشم چاچا نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کارخانہ میں چلاؤں گا۔''

یہ غیر متوقع خوشخبری سنتے ہی خوجہ کاک کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی اور اُس نے یہ کہتے ہوئے ریشم چاچا کو گلے لگایا کہ

''تمہارا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھول پاؤں گا۔''

ریشم چاچا ریشمی دوشالے بننے کا ایک تجربہ کار کاریگر تھا۔ یہ ریشمی دوشالے بنانے میں اتنا ماہر تھا کہ لوگ اُسے اُس کے اصلی نام کے بجائے ریشم چاچا کے نام سے ہی یاد کیا کرتے تھے۔ خوجہ کاک نے اگرچہ کئی مرتبہ ریشم چاچا سے کہا بھی تھا کہ وہ اگر اُس کے کارخانے میں کام کرے گا تو وہ اُسے دُگنی تنخواہ دے گا، لیکن ریشم چاچا یہ کہہ کر ہمیشہ انکار کرتا رہتا کہ وہ اپنے مالک کے ساتھ چند پیسوں کے بدلے دھوکہ نہیں کرسکتا۔ برسوں سے وہ جس آدمی کا کارخانہ سنبھالتا آیا ہے وہ اُس کا بھروسہ نہیں توڑ سکتا۔

ریشم کے دوشالے بنانے میں ریشم چاچا کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ یہ اُس کا خاندانی پیشہ تھا۔ جن لوگوں کے ہاں بھی اُس نے کام کیا تھا۔ ان کے گھروں میں ریشم چاچا کی کاریگری سے چاندی ہی چاندی دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن ریشم چاچا کی قسمت میں دوسرے سینکڑوں کاریگروں کی طرح دو وقت کی روٹی کے سوا کچھ نہ لکھا تھا۔ ریشم چاچا جس بستی میں رہتا تھا وہاں کے سب لوگ ریشم کے کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ اسی مناسبت سے اُس بستی کا نام ریشم آباد پڑا تھا۔ بستی صرف ریشم آباد نام کی تھی، اصل میں وہاں غریبی اور ناداری کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یہ لوگ مہد سے لے کر لحد تک ان کارخانوں میں محنت مزدوری کرتے رہتے اور اس کا معاوضہ بس اتنا تھا کہ گھر کا چولہا ٹھنڈا ہونے سے بچ جاتا۔

دوسری جانب فیکٹریوں کے مالک ان لوگوں کی محنت کے بل پر عیش وعشرت کی زندگی گزارتے۔

چند دنوں بعد ریشم چاچا نے خوجہ کاک کے کارخانے کا کام سنبھال لیا۔ اُس کے کام سنبھالتے ہی خوجہ کاک کی قسمت چمک اُٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے مال اتنا بکنے لگا کہ جو لوگ کل تک خوجہ کاک کے مِل کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے وہی اب مال کے لئے ایڈوانس بکنگ کروانے لگے۔ خوجہ کاک کے گھر میں دولت کی ریل پیل اتنی بڑھ گئی کہ بنک کا سارا قرضہ سود سمیت ادا کرنے کے علاوہ ایک بڑی جائیداد کا بھی وہ مالک بن گیا۔ لوگ بڑی حیرانی کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے اُس کی دولت وحشمت کا تذکرہ کرنے لگے۔

خوجہ کاک ایک شاندار گاڑی میں مِل کی طرف جاتا تھا اور ریشم چاچا کے ساتھ دن بھر کے تجارتی معاملات پر صلح مشورہ کرتا رہتا۔ ایک دن اُس نے ریشم چاچا کو دو عدد ریشمی شال بنانے کے لئے کہا۔ شال بنانے کے بعد جب ریشم چاچا نے اُس کی خدمت میں پیش کئے تو خوجہ کاک نے ایک شال ریشم چاچا کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ تم اپنی بیٹی کے

لئے رکھنا، شادی کے دن کام آئے گا۔ ریشم چاچا حیرانی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہنے لگا۔

''خوجہ صاحب! یہ قیمتی شال ہے میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔''

''آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔'' خواجہ کاک اپنائیت کے لہجے میں کہنے لگا۔

''آپ کی بیٹی مجھے اپنی بیٹی جیسی ہے اور کارخانے کے اصل مالک تو آپ ہیں۔''

بہرحال ریشم چاچا آگے کچھ نہ بول سکا اور وہ شال لے کر گھر چلا گیا۔ کئی برسوں تک کارخانے میں کام کرتے کرتے ریشم چاچا کی آنکھوں کی بینائی میں فرق آنے لگا تھا۔ ایک دن جب وہ کپڑے بننے کی مشین چلا رہا تھا تو اچانک اُس کا ہاتھ مشین کی زد میں آ کر کٹ گیا۔ کئی مہینوں تک اسپتال میں ایڈمٹ رہنے کے باوجود بھی وہ ٹھیک نہ ہو سکا۔ روز بروز جب وہ کمزور ہوتا چلا گیا تو ایک دن ڈاکٹروں نے اُس کی بچی سے کہا کہ وہ کسی بھی طرح پچاس ہزار روپے کا انتظام کرے تاکہ ریشم چاچا کا آپریشن ہو سکے۔ بیٹی کو پریشان دیکھ کر ریشم چاچا نے اُسے خوجہ کاک کے پاس بھیجا۔

''بیٹی کیسے آنا ہوا؟'' خوجہ کاک نے پوچھا۔

''خوجہ کاکہ'' ! ریشم چاچا کی بیٹی آنسو بہاتے بہاتے بولی۔ ''بابا کا آپریشن کروانا ہے اس کے لئے پچاس ہزار روپے درکار ہیں۔''

''پچاس ہزار؟'' خوجہ کاک حیرانی کے ساتھ کہا۔ ''دیکھو بیٹی! یہ تو بڑی رقم ہے۔ اوپر سے اپنی بچی کی شادی کے دن بھی قریب آ رہے ہیں۔ جس پر بہت سے پیسے صرف ہو رہے ہیں۔''

''خوجہ کاکہ۔'' ریشم چاچا کی بیٹی منت سماجت کرنے لگی۔ ''آپ کے علاوہ ہم کس کے پاس جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ اگر جلدی آپریشن نہ ہوا تو بابا کی جان کو خطرہ ہے۔''

''اس وقت پیسوں کا انتظام نہیں ہو سکتا ہے۔'' خوجہ کاک نے تند خُوئی سے

جواب دیا"البتہ بچی کی شادی کے بعد دیکھا جائے گا۔"

ریشم چاچا کی بیٹی مایوس ہو کر وہاں سے واپس لوٹی۔ اسپتال پہنچ کر وہ بابا کے بیڈ کے پاس بیٹھ گئی۔ ریشم چاچا کے پوچھنے پر جب اُس نے خوجہ کاک کی دل توڑنے والی بات بتائی تو ریشم چاچا نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا"بیٹی! ہماری قسمت میں ریشم کی گانٹھ پڑی ہے۔"

ڈاکٹروں نے چیک اَپ کرنے کے بعد یہ کہتے ہوئے ریشم چاچا کو اسپتال سے رخصت کر دیا کہ جب پیسوں کا انتظام ہو جائے گا تو اُسے دوبارہ ایڈمٹ کرانا۔ ریشم چاچا کے جسم میں انفکشن زہر کی طرح پھیلتا گیا اور چند دنوں تک اس زہر نے پھیلتے پھیلتے اُس کی زندگی کا خاتمہ کر ڈالا۔

خوجہ کاک کے گھر میں شادی کی تقریب بڑی دھوم دھام سے چل رہی تھی۔ سینکڑوں مہمان دعوت کا مزا اُڑا رہے تھے۔ دولہے کے استقبال کے لئے صحن میں قالین بچھائے جا رہے تھے۔ ریشم چاچا کی بیٹی بدحواسی کے عالم میں وہاں پہنچ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے قیمتی شال کو سینے سے لگائے رکھا تھا۔ آنسوؤں کی دھار سے قیمتی شال تر بتر ہو رہا تھا۔ اُسے خوجہ کاک کے محل نما مکان کے چمکتے رنگ و روغن میں اپنے باپ کے خون کی سُرخی نظر آ رہی تھی۔ خوجہ کاک اپنی بیٹی کو جہیز میں دینے والی دس لاکھ کی گاڑی کا سنگار کرانے میں مگن تھا۔ ریشم چاچا کی بیٹی رقت آمیز لہجے کے ساتھ خوجہ کاک کی گود میں ریشمی دوشالہ ڈالتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بھیک مانگنے لگی۔

"اے امیر خوجہ کاک! مجھے اس ریشمی شال کے بدلے اپنے غریب بابا کے لئے کفن چاہئے۔"

○○○

رحمت کے پھول

رئیس خان کے گھر سے جب چیخ و پکار کی آواز اُٹھی تو پاس پڑوس کے لوگ اس کے گھر کی جانب دوڑ پڑے۔ سلیم خان اپنی بیوی کو بڑی بے رحمی سے پیٹ رہا تھا۔ دو معصوم بچیاں ماں کے ساتھ لپٹ کر رو رہی تھیں۔ رئیس خان نے سلیم خان کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین لیا اور اُسے دھکے مار مار کر کمرے سے باہر کر دیا۔ ایسے واقعات اس گھر میں کبھی نہ کبھی رونما ہوتے رہتے تھے اور اس تعلق سے افراد خانہ کے درمیان کبھی کبھار تلخ کلامی بھی ہو جاتی تھی۔ گھر کا امن وسکون افراد خانہ کے آپسی پیار و محبت سے ہی قائم رہ سکتا ہے اور جب سوچ میں بگاڑ آ جائے تو نہ صرف امن وسکون کے خوشحال محل میں ویرانی چھا جاتی ہے بلکہ گھر کی عزت بھی تماشا بن جاتی ہے۔

سلیم خان اور شکیلہ کی شادی کے سات برس مکمل ہو رہے تھے۔ سلیم خان نے گریجویشن کے بعد تجارت کا پیشہ اپنایا تھا اور مقامی مارکیٹ میں اپنا ایک کلاتھ شاپ کھولا تھا۔ پہلے پہل اُسے بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ ہمت نہیں ہارا۔ چند برسوں کے اندر اندر اس کی محنت رنگ لائی اور دکان کا کام اتنا بڑھ گیا کہ اُسے پل بھر بیٹھنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔

شکیلہ کے آنے سے ان کے گھر کی خوشیاں دوبالا ہو گئیں۔ وہ اگر چہ میٹرک پاس ہی تھی لیکن گھر گرہستی سنبھالنے میں ایسی سلیقہ شعار کہ گھر کی خوشحالی میں چار چاند لگ گئے۔ وہ تمام گھر والوں کے ساتھ بڑے مہذبانہ انداز اور شگفتہ روی سے پیش آتی تھی۔

اپنے ساس سُسر کی خدمت وہ جس اپنائیت اور خوش اسلوبی سے انجام دیتی تھی وہ خویش واقارب میں مثال بن گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ساس سُسر اُسے بہو کی بجائے بیٹی کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

چند برس بڑے خوش وخرم سے گزر گئے۔ میاں بیوی کے درمیان کبھی بھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ لیکن رفتہ رفتہ دونوں کی مٹھاس بھری زندگی میں کڑواہٹ آنے لگی۔ کڑواہٹ کا سبب ان کی دو معصوم لڑکیاں تھیں۔ شکیلہ کا پاؤں پھر سے بھاری تھا۔ گھر کے کام کاج میں اگرچہ اُس کی ساس اس کا ہاتھ بٹاتی رہتی تھی لیکن شکیلہ کے ذہن پر ہمیشہ ایک انجانے خوف کا سایہ چھایا رہتا تھا اور وہ خوف تھا تیسری اولاد کا! وہ سوچتی رہتی کہ اگر اس بار بھی لڑکی نے جنم لیا تو کیا معلوم اُس کا خاوند اُس کے حق میں کیا فیصلہ سنا دے۔ وہ یہ بات تو خود سمجھتی تھی کہ لڑکی یا لڑکے کا جنم نہ اُس کے بس میں ہے اور نہ اُس کے خاوند کے بس میں، یہ پھل تو اوپر والے کے فیصلے کے مطابق دنیا میں آتے ہیں لیکن اُس کا خاوند لڑکے کی تمنا میں ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔ لڑکے کا بھوت اس کے ذہن پر ایسے سوار ہوا تھا کہ وہ معمولی بات پر بھی شکیلہ کو یہ کہتے ہوئے زدوکوب کرنا شروع کر دیتا کہ ''تمہارے اندر لڑکا پیدا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے اس لئے تمہاری گود سے صرف لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں، تم میں ضرور کوئی کھوٹ ہے۔''

ایک رات جب سلیم خان دکان سے گھر لوٹا تو شکیلہ نے کھانا اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ کل اُسے میکے جانا ہے۔

''تجھے کون جانے سے منع کر رہا ہے۔'' سلیم خان طنز کرتے ہوئے بولا ''جاؤ! اور ایک مصیبت ساتھ لے کر آنا''۔

''مصیبت'' شکیلہ تند لہجے میں بولی ''بیٹیوں کو مصیبت مت کہو۔ کس والدین کو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا نام بیٹا روشن کرے گا یا بیٹی...؟''

یہ سنتے ہی سلیم خان کی رگِ حمیت پھڑک اُٹھی اور اُس نے ڈنڈا اُٹھا کر شکیلہ کو

پیٹنا شروع کر دیا۔ شور و غل سن کر گھر کے دوسرے لوگ بھی ان کے کمرے میں آ گئے اور سلیم خان کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین لیا گیا۔ سلیم خان غصے کی آگ میں جل بھُن رہا تھا۔ اس کا والد رئیس خان جب کمرے کے اندر آیا تو بہو کے آنسو اُس سے برداشت نہیں ہوئے۔ طیش میں آ کر اُس نے سلیم خان کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔

''جاہل انسان ...! لڑکیاں بھی گھر کی زینت ہوتی ہیں۔ اسلامی تعلیم کے مطابق لڑکیوں کی اچھی پرورش انسان کو جہنم سے بچا سکتی ہے۔ لڑکا یا لڑکی، دونوں خدا تعالیٰ کے عطا کردہ دو میٹھے پھل ہیں اور تم جیسے جاہل لوگ میٹھے پھلوں کے درمیان امتیاز کر کے اپنی نادانی کا ثبوت فراہم کرتے ہو۔''

باپ کی سرزنش سے سلیم خان کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ پشیمان ہو کر کمرے سے نکل گیا۔ دوسرے دن سلیم خان باپ کی ہدایت کے مطابق شکیلہ کو سسُرال چھوڑنے چلا گیا۔

شکیلہ ہمیشہ پریشان سی رہتی تھی۔ وہ سوچتی رہتی کہ اگر پھر سے لڑکی کا جنم ہوا تو پتہ نہیں سلیم خان کیا کر بیٹھے گا۔ اسی فکر نے اس کا بُرا حال کر دیا تھا۔ لیکن شکیلہ کی پریشانی اس وقت خوشی میں بدل گئی جب اس نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔ لڑکے کی خوشخبری سے دونوں گھرانے چہک اُٹھے۔

چند مہینے بعد شکیلہ کی واپسی سے گھر کی خوشیاں دو چند ہو گئیں۔ سلیم خان نے اپنے بیٹے کا نام ظفر یعنی کامیابی رکھا۔ گھر میں اب شانتی ہی شانتی نظر آ رہی تھی۔ سلیم خان ہر وقت خوشی سے جھومتا رہتا اور دکان سے گھر لوٹنے کے بعد بچوں سے ایسے گھل مل جاتا کہ شکیلہ اسے کبھی کبھی ازراہِ مذاق چھیڑا بھی کرتی کہ زیادہ لاڈ پیار سے بچے بگڑ جاتے ہیں اور سلیم خان بھی مسکرا کر کہتا ''تم میرے بچوں کے پیار میں دخل مت دیا کرو۔''

اسکول جانے کی عمر میں سلیم خان نے ظفر کا ایڈمیشن شہر کے ایک مشہور اسکول میں کروایا۔ وقت گزرتا رہا۔ لڑکیاں جی لگا کر پڑھتی رہیں لیکن ظفر پڑھائی کی طرف کم ہی

دھیان دیتا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کا چال چلن بھی بگڑتا گیا۔ سلیم خان نے اسے ہر قسم کی سہولت میسر رکھی تھی۔ گھر میں کمپیوٹر اور گھومنے پھرنے کے لئے شاندار گاڑی، لیکن اس سب کے باوجود وہ پڑھائی کے بجائے آوارہ گردی کرنے میں وقت گزارتا رہتا۔ کئی بار یار دوستوں نے سلیم خان کو ظفر کے بُری عادات کے بارے میں بتایا بھی لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ کر بات ٹالتا رہا کہ وقت آنے پر بچہ خود سنبھل جائے گا۔ شکیلہ بھی اُسے وقتاً فوقتاً ظفر کی آوارہ گردی کے متعلق کہتی رہتی اور وہ یہ کہہ کر اُسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیتا کہ تم بیٹیوں کی طرف دھیان رکھو، ظفر تو لڑکا ہے اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

لیکن بدلتے وقت کے ساتھ سلیم خان کو بھی ظفر کے بگڑتے چال چلن سے تشویش ہونے لگی۔ اس نے ظفر کو بہت بار سمجھایا بھی کہ وہ اپنے آپ کو سدھارے اور پڑھائی کی طرف دھیان دے لیکن ظفر تھا کہ اپنی مستی کے عالم میں مست۔ وہ نہ صرف اسکول میں غنڈہ گردی کرتا رہا بلکہ اب وہ لڑکیوں کو بھی چھیڑنے میں عار محسوس نہ کرتا تھا۔

سلیم خان کی بڑی لڑکی نے ایم اے کے امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی اور یونیورسٹی کی طرف سے اُسے گولڈ میڈل ملنے والا تھا۔ گھر کے تمام لوگ خوش تھے۔ سلیم خان نے ظفر کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ ''تم بھی محنت کرو اور پڑھ لکھ کر کچھ اچھا بن کے دکھاؤ۔''

''میں کیا پڑھتا نہیں ہوں؟'' ظفر نے غصے میں کہا۔

''پڑھتا تو تُو بھی ہے میرے لال۔'' ماں نے اُسے بوسہ دیتے ہوئے کہا ''لیکن بہنوں کی طرح محنت کر، تاکہ تُو بھی ہمارا نام روشن کر سکے۔''

تمام لوگ اس دن کا انتظار بڑی بے تابی سے کر رہے تھے اور ان کا انتظار اُس دن ختم ہو ہی گیا جب ان کی ذہین اور باکردار بیٹی گولڈ میڈل لے کر بڑی شان سے گھر میں داخل ہوئی۔

سارا گھر خوشی سے جھوم اُٹھا اور سلیم خان کے گھر میں مبارکباد دینے والے

لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ سلیم خان اپنی بیٹی کی صلاحیتوں کے گُن گا تا رہا اور شکریہ کے الفاظ زبان سے ادا کرتا رہا۔

گھر میں ابھی خوشی کی چہل پہل جاری تھی کہ شام کے وقت سلیم خان کے گھر پر اچانک پولیس نمودار ہوئی اور ظفر کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنے لگی۔

سلیم خان نے جب ظفر کو آواز دے کر بُلایا تو پولیس والے اُسے ایک لڑکی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے لے گئے۔

غم کی کڑواہٹ نے خوشی کی مٹھاس کو چوس لیا۔ سارا گھر ماتم کدہ بن گیا۔

سلیم خان نے آنسو بہاتے ہوئے دونوں بیٹیوں کو گلے لگاتے ہوئے بڑے دردناک لہجے میں کہا ''آج میں زندگی کے بڑے فریب کو سمجھنے میں کامیاب ہو گیا۔ بے شک لڑکیاں رحمت کے پھول ہوتی ہیں۔''

OOO

گلہ قصائی

منحوس چہرے پر نظر پڑتے ہی گلہ قصائی کے تن بدن میں آگ سی دہک اٹھتی اور وہ سامنے پڑے لکڑی کے تختے پر موجود گوشت کو تیز دھار چاقو سے بوٹی بوٹی کر ڈالتا۔ گُلہ قصائی کا یہ حیرت خیز عمل کئی مہینوں سے جاری تھا۔ اس کی دکان کے سامنے چاہے خریدار ہو یا نہ ہو پھر بھی منحوس چہرے کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھ خود بخود چاقو تھام لیتے اور اندھا دُھند گوشت کاٹنا شروع کر دیتے۔ نفرت انگیز غصے سے اُس کی آنکھیں لال پیلی ہو جاتیں اور گالوں پر سُرخی پھیل جاتی۔ کبھی کبھی کوئی خریدار گلہ قصائی کی بدلتی عجیب و غریب کیفیت سے تھوڑا سا حیران ہو جاتا۔

گُلہ قصائی کی دکان سرکاری اسپتال کے مین گیٹ پر تھی۔ جوانی سے لے کر اب اس ادھیڑ عمر میں بھی وہ بڑی سرعت سے اپنا کام کرتا۔ اُس کی خوش اخلاقی اور ایمانداری نے خریداروں کے دل جیت لئے تھے۔ وہ ہر کسی کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آتا لیکن ڈاکٹروں کی عزت کرنے میں وہ کچھ زیادہ ہی فراخ دل ثابت ہوا تھا۔ جب بھی کسی ڈاکٹر کی گاڑی گیٹ سے آتی جاتی تو اُس کا ہاتھ سلام کرنے کے لئے فوراً اٹھ جاتا اور جب بھی کوئی ڈاکٹر گوشت خریدنے آتا تو گُلہ قصائی گوشت تولنے کے بعد ایک دو ٹکڑے لفافے میں زیادہ ڈال دیتا۔ ڈاکٹر لوگ جب گُلہ قصائی کی دریادلی کی تعریف کرتے تو وہ مسکراتے ہوئے کہہ اٹھتا کہ ڈاکٹر کا پیشہ مسیحائی کا پیشہ ہوتا ہے۔ آپ لوگ نہ صرف عوام کی خدمت کرتے ہیں بلکہ ان کے دُکھ درد کا علاج کر کے انھیں تکلیف سے بھی نجات دلاتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے وہ اپنی زندگی کا ایک یادگار واقعہ انھیں ضرور سناتا کہ

برسوں پہلے جب اس کی بیوی دردزہ کی حالت میں اسی اسپتال میں ایڈمٹ ہوئی تھی تو ڈاکٹر مشتاق صاحب رات بھر اُس کے علاج معالجے میں جٹے رہے اور صبح کے وقت اُس کا آپریشن کرکے ایک پھول سی بچی میری گود میں مسکراتے ہوئے ڈال دی تھی۔ میں نے شکریہ کرتے ہوئے جب چند روپے انھیں دینے کی کوشش کی تھی تو اُنہوں نے سخت ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں ایک سرکاری ملازم ہوں۔ مجھے سرکار آپ لوگوں کی خدمت کرنے کے لئے ہی تنخواہ دیتی ہے۔ جاؤ، ان پیسوں سے بچی کے لئے کپڑے لاؤ۔

وقت بدلتا رہا اور بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی سوچ بھی بدلتی گئی۔ انسانی دلوں میں انسانیت کے بدلے مادّیت کا زہر پھوٹنے لگا۔

گُلہ قصائی کی بچی کا پاؤں بھاری تھا۔ وہ دوپہر کے وقت دکان کے کام کاج میں لگا ہوا تھا۔ اُس کا چھوٹا بیٹا دوڑتے دوڑتے دکان پر آکر کہنے لگا کہ ماں نے کہا ہے کہ بہن کی طبیعت کچھ خراب سی ہوگئی ہے اس لئے جلدی گھر آجاؤ۔ گُلہ قصائی دکان بند کرکے گھر کی جانب دوڑ پڑا اور بیٹی کو آٹو میں لاکر اسپتال میں ایڈمٹ کروایا۔

بیٹی دردزہ سے کراہ رہی تھی لیکن گُلہ قصائی ڈاکٹر کے علاج سے مطمئن تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ ڈاکٹر کے ساتھ اُس کی علیک سلیک تو ہے ہی اس لئے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک آدھ گھنٹہ گزرنے کے بعد نرس نے گُلہ قصائی کے ہاتھ میں ایک پرچی تھمادی۔ گُلہ قصائی پرچی لے کر مارکیٹ میں دوائی کی دکان پر گیا اور دوافروش سے دوائی دینے کو کہا۔ دوافروش گُلہ قصائی کا جان پہچان والا آدمی تھا۔ اُس نے پرچی دیکھ کر گُلہ قصائی سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب سے کہو کہ وہ دوسری کمپنی کی دوا لکھ کر دیں لیکن گُلہ قصائی کو یہ بات سمجھ نہیں آئی اور وہ دوافروش سے جلدی جلدی دوا لے کر اسپتال کی جانب دوڑ پڑا۔

گُلہ قصائی وارڈ سے باہر بڑی بے قراری سے چہل قدمی کررہا تھا۔ بیٹی کی کراہنے

کی آوازیں اُس کے دل کو چھلنی کر رہی تھیں۔ اُس کی آبدیدہ نگاہیں بار بار اوپر کی جانب اٹھ رہی تھیں اور وہ سرد آہیں لیتے لیتے سرگوشی کے انداز میں دُعا مانگ رہا تھا کہ اللہ اُس کی بیٹی کو نظرِ رحمت سے نوازے۔ دن ڈھلتے ہی نرس نے گلہ قصائی سے کہا کہ ڈاکٹر کی کوشش کے باوجود بھی آپ کی بیٹی کو کوئی راحت نہیں مل رہی ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب کی ڈیوٹی ختم ہو رہی ہے۔ اُن کو کلنک پر جانا ہے۔ آپ کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تو آپ کو اسی وقت شہر کے اسپتال جانا پڑے گا یا ڈاکٹر صاحب کے پرائیوٹ کلنک پر اس کا علاج ہو سکتا ہے۔ جلدی مشورہ کرو نہیں تو دیر ہو جائے گی اور آپ کی بیٹی کو خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔

نرس کی باتیں سُن کر گلہ قصائی پریشان ہو گیا۔ بیوی سے مشورہ کر کے بیٹی کو کلنک میں ایڈمٹ کیا گیا۔ نرس نے دوائی کی ایک اور پرچی تھماتے ہوئے گلہ قصائی سے کہا کہ اس کا میجر آپریشن کرنا پڑے گا۔ اس کے لئے تقریباً بیس ہزار کا انتظام کرنا ہوگا۔ بیس ہزار کا نام سنتے ہی گلہ قصائی سکتے میں آ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اتنی بڑی رقم کا انتظام کیسے ہوگا۔ چند ہزار تو میں نے اس دن کے لئے سنبھال کر رکھے تھے، ان میں زیادہ تر خرچ ہو گئے۔ گلہ قصائی نے جب یہ بات بیوی کو بتائی تو اس کا سر بھی چکّر کھانے لگا۔ میاں بیوی ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ زندگی اور موت کی کشمکش میں جھول رہی بیٹی کے ہاتھ میں سونے کا کنگن دیکھ کر باپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار نکل پڑی۔ بیٹی کے ہاتھ سے سونے کا کنگن لیتے ہوئے گلہ قصائی کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے آج اُس نے اپنے ہی گھر میں ڈاکہ ڈالا ہو۔

مارکیٹ بند ہونے جا رہا تھا۔ گُلہ قصائی نے ایک دکان پر چڑھ کر سُنار کے سامنے کنگن رکھ دیا۔ سُنار نے کنگن کا وزن کر کے گلہ قصائی سے کاروباری زبان میں کہا کہ سونے کا بھاؤ گر گیا ہے اور پھر بھی یہ استعمال شدہ سونا ہے اس لئے پندرہ ہزار سے زیادہ اس کی قیمت نہیں ہے۔ بر حال گلہ قصائی کے اصرار پر سُنار نے اُسے سولہ ہزار دے دیئے اور گُلہ قصائی پیسے لے کر بھاگتے ہوئے کلنک پہنچا۔

پیسے جمع کرنے کے بعد جب گُلہ قصائی، ڈاکٹر کو لے کر کمرے میں داخل ہوا تو اپنی بیٹی کی آخری آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔۔ بابا۔۔!

گُلہ قصائی کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ ہر طرف چیخنے چلانے کی آوازیں سُن کر جیسے وہ بہرہ ہو گیا۔

گھر میں ماتم داری کے دن گزارنے کے بعد گُلہ قصائی دل پر پتھر رکھ کر دکان پر پھر سے بیٹھ گیا۔ وہ اب سرکاری اسپتال کو ذبیح خانہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اُس کا ہاتھ نہ کسی ڈاکٹر کو سلام کرنے کے لئے اٹھتا تھا اور نہ ہی وہ کسی ڈاکٹر کو ڈاکٹر مشتاق کی داستان سناتا تھا۔ اُس منحوس چہرے کی گاڑی جب گیٹ سے اندر چلی جاتی تو گُلہ قصائی کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی اور وہ تیز دھار چاقو کو گوشت پر اندھا دُھند چلانا شروع کر دیتا۔

عیدِ قربان کا تہوار تھا۔ عرفہ کی گہما گہمی سے بازار چمک رہا تھا۔ گُلہ قصائی کی دکان پر لوگوں کی بھیڑ لگی تھی۔ گُلہ قصائی گوشت کٹائی میں مصروف تھا کہ ایک مانوس آواز نے اُسے چونکا دیا۔ منحوس چہرے کو دیکھتے ہی گُلہ قصائی کی آنکھیں لال پیلی ہو گئیں۔ اُس کے ہاتھ تھر تھرانے لگے۔ ڈاکٹر مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ اُسے ایک کلو گوشت چاہیے وہ بھی بھیڑ کا کیونکہ اُس کی بیٹی کا پاؤں بھاری ہے۔ پیسے دیتے ہوئے اُس نے مزید کہا کہ وہ اسپتال سے چھٹی کے بعد گوشت لے گا۔

''بیٹی کا پاؤں بھاری ہے!'' کی آواز بار بار گُلہ قصائی کے کانوں سے ٹکراتی رہی۔ اس آواز نے اُس کے اندر ایک خوشگوار احساس جگا دیا۔

دکان کے کام سے فراغت پا کر وہ دوا فروش سے دوائی کی ایک شیشی لایا۔ شیشی کا ڈھکن کھول کر دوائی پانی میں ملا دی اور گوشت کو پانی میں بھگونے لگا۔ اُس کے ذہن میں عجیب و غریب قسم کے خیالات آتے رہے۔ وہ بڑی بے صبری سے ڈاکٹر کا انتظار کرتا رہا۔

آدھے گھنٹے کے بعد ڈاکٹر جونہی گوشت لینے کے لئے آیا تو اُس نے مسکراتے ہوئے ڈاکٹر کے ہاتھ میں گوشت بھر الفافہ تھما دیا۔ ڈاکٹر پارک والی جگہ پر گاڑی کی

طرف جانے لگا۔

گُلہ قصائی راحت کی سانس لے کر خیالات کے گہرے سمندر میں کھو گیا۔

ڈاکٹر نے جب گاڑی اسٹارٹ کی تو گُلہ قصائی کی آنکھوں کے سامنے عید کی خوشی کا منظر رقص کرنے لگا۔ اس کا ضمیر نیکی اور بدی کے بھنور میں ہچکولے کھانے لگا۔

ڈاکٹر کے سلوک سے بدی کا پلڑا بھاری ہوتا رہا۔ یہی وہ منحوس چہرہ تھا جس نے گُلہ قصائی کی انسانیت کے جذبے پر حیوانیت کا تیشہ چلایا تھا۔ ڈاکٹر کو گوشت دے کر اُسے یک گونہ سکون محسوس ہو رہا تھا۔

وہ ان ہی عجیب وغریب خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ مسجد شریف سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی۔ اللہ اکبر کی صدا سے گلہ قصائی کو ایک جھٹکا سا لگا۔ نیکی کا پلڑا بھاری ہونے لگا۔ گُلہ قصائی کا ضمیر اسے کوسنے لگا کہ تُو صرف قصائی ہے جلّاد نہیں۔

بیٹی کی ''بابا'' والی آواز پھر سے گُلہ قصائی کے کانوں سے ٹکرائی۔ لیکن یہ آواز جلّاد سے بدلہ لینے کے لئے نہیں بلکہ بیٹی کی جان بچانے کی آواز تھی۔

گُلہ قصائی ننگے پاؤں گاڑی کی طرف دوڑ پڑا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر گوشت کا لفافہ اٹھاتے ہوئے بولا:

''یہ بکرے کا گوشت ہے بھیڑ کا نہیں۔''

○○○

سفید جنگ

''یہ کس کی لاش پیڑ پر لٹک رہی ہے...؟''

وہ حیران ہوکر سوچنے لگا۔اس ویرانے میں یہ لاش...!یہ کس کی ہوسکتی ہے...! اب میں کیا کروں؟ خیر ابھی میں لاش کے اتنے قریب نہیں پہنچا ہوں کہ اسے پہچان سکوں۔کیا لاش کو نظرانداز کر کے چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں یا پولیس کو اطلاع دوں۔اوہ...میں بھی کیا الٹا سیدھا سوچنے لگا، بھلا اس ویرانے میں پولیس کا کیا کام۔ ویسے بھی اب تو پولیس کا کام زندوں کو لاشیں بنانا ہی رہ گیا ہے اور اگر میں نے پولیس والوں کے سامنے ایک لاش کا ذکر چھیڑا تو وہ الٹا میرا مذاق اڑائیں گے اور میری دماغی حالت پر شک کریں گے کہ اس دور میں لاش کے متعلق پوچھ تاچھ...!

لیکن یہ تو ایک انسانی جان کے زیاں کا مسئلہ ہے۔ ہر چیز کا بدل ہوسکتا ہے لیکن انسان..؟ خیر اب اگر پولیس نے کاروائی شروع بھی کی تو بھی مجھے ہی تفتیش سے گزرنا پڑے گا کہ لاش کس کی ہے، آپ کا لاش سے تعلق؟ یہ ہمدردی کس لئے، کس نے پھانسی دے دی وغیرہ وغیرہ۔

ایک سوال تو قابل غور ہے کہ کیا اس انسان کو کسی نے پھانسی پر لٹکایا ہے یا یہ خود اپنے آپ کو پھانسی دینے پر مجبور ہوا..؟ مگر میں یہ سب کیوں سوچ رہا ہوں۔ میں تو خود اتنا پریشان ہوں کہ اپنے مسائل سے بھی نپٹ نہیں سکتا۔لیکن یہ لاش پیڑ سے نیچے کیوں آرہی ہے۔ ارے یہ تو اب میری ہی جانب بڑھ رہی ہے۔لاش کو اپنی طرف بڑھتے

دیکھ، وہ خوفزدہ ہوکر بھاگنے لگا۔ اس کی رفتار جتنی تیز ہو رہی تھی، لاش کی رفتار بھی اتنی ہی بڑھ رہی تھی۔ سانس پھولنے کے ساتھ ساتھ اس کا گلا بھی خشک ہونے لگا اور ذہن میں انتشار کا آتش فشاں پکنے لگا۔ پیاس کی شدت اسے نیلی جھیل کے کنارے تک لے آئی۔

اس کا وجود کرب کی چکّی کے دو پاٹوں میں پھنس چکا تھا۔ وہ اکثر خواب میں سفید ہاتھیوں اور ابابیلوں کی ہنگامہ آرائی دیکھ کر لرز اٹھتا۔ اس کا دل اطمینان سے خالی اور ذہن انتشار کا جنگل بن چکا تھا۔ وہ اکثر سوچتا رہتا کہ دل سے تسکین کی مٹھاس کون نچوڑ کر لے گیا اور دماغ میں انتشار کا جنگل کہاں سے امنڈ آیا۔ تناؤ کا دورہ اس پر اکثر نیند کے دوران پڑتا، اس کی صرف آنکھیں بند ہوتیں لیکن دماغ بیدار رہتا اور جس رات وہ ارادہ کرتا کہ آج وہ کسی بھی مسئلے پر بغیر سوچے سونے کی کوشش کرے گا تاکہ دماغ کو راحت دے کر سکون کی نیند سوئے تو اس رات وہ اور زیادہ تناؤ کی زد پر رہتا۔ وہ دنیا کی بدلتی صورتحال سے باخبر تھا۔ کبھی کبھی اس کا دل گھبراہٹ کا شکار ہو جاتا لیکن وہ یہ سوچ کر منفی کو مثبت بنا دیتا کہ وہ انسان ہے اور انسان بن کر ہی جینا چاہتا ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی اطمینان کی زندگی گزارتے دیکھنا چاہتا ہے۔

وہ انٹرنیشنل ادارے کا ایک سینئر آفیسر تھا۔ یہ ادارہ دنیا میں امن وامان بحال رکھنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی بدامنی کا ماحول پھیل جاتا تو اس ادارے کی ذمہ داری تھی کہ وہ بغیر کسی جانب داری کے امن کو بحال کرنے میں اپنا رول ادا کرے۔

وہ جب دفتر پہنچا تو حسبِ معمول دوسرے لوگوں کے ساتھ ہائی، ہیلو کرتے ہوئے اپنے چیمبر کی طرف بڑھتا رہا۔ علیک سلیک کرتے ہوئے اسے دفتر کا ماحول کچھ بدلا بدلا سا محسوس ہوا۔ اس دفتر میں دنیا کے کئی ممالک کے لوگ تعینات تھے۔ یہ لوگ ایک ایسے ادارے سے تعلق رکھتے تھے جہاں پر کسی قسم کی اونچ نیچ یا بھید بھاؤ کی گنجائش تک نہ تھی۔ ادارے کا ایک ہی مشن تھا اور وہ تھا مشن انسانیت۔ اس نے جلد ہی منفی خیال

کو ذہن سے جھٹک دیا اور اپنے چیمبر میں پہنچ کر ستانے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے سسٹم آن کیا اور ٹیبل پر رکھے گلاس کو ہاتھ میں اٹھایا لیکن گلاس خالی دیکھ کر بیل بجائی۔ بیل کی آوز سنتے ہی چپراسی 'یس سر' کہتے ہوئے حاضر ہوا۔ اس نے جب گلاس کی طرف اشارہ کیا تو وہ 'سوری' کہہ کر پانی بھرا گلاس لے آیا۔

پانی کے چند گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ آج پہلی بار چپراسی نے غفلت برتی ہے۔ سسٹم ریفرش کرنے کے بعد جب کانفیڈینشل سیکشن پر کلک کیا تو اس نے پاس ورڈ طلب کیا۔ پاس ورڈ لگا کر لاگ اِن پر کلک کرنے کے ساتھ ہی رانگ پاس ورڈ کا سگنل دکھائی دیا۔ دو تین دفعہ پاس ورڈ دے کر جب اسکرین پر 'ثابت کرو کہ تم روبوٹ نہیں ہو' کی وارننگ دکھائی دی اور ساتھ ہی کنٹرول روم سے رابطہ کرنے کی ہدایت ملی تو اس نے فون پر متعلقہ اتھارٹی سے رابطہ کیا۔ وہاں سے کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر پاس ورڈ تبدیل کرنے کی ہتک آمیز بات سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ سوچنے لگا کہ اتنے برسوں تک اس ادارے میں فرض شناسی کا یہ صلہ کہ مجھ کو بھی شک کے دائرے میں لایا گیا۔ اس نے جب دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش کی تو کوئی مثبت رسپانس نہ پا کر وہ چیمبر سے باہر نکل گیا۔ اس تشویش ناک حالت میں اسے یہی بہتر لگا کہ وہ گھر چلا جائے۔ اس نے دفتر کے سارے لوگوں پر ایک نظر دوڑائی۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے یہ سب اجنبی چہرے ہیں، جو اسے جانتے تک نہیں۔

تناؤ کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے گھر پہنچ کر اس نے بیوی سے کافی بنانے کے لئے کہا۔ اس نے کافی بنا کر کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا کہ آج آپ جلدی کیوں لوٹ آئے۔ اس نے کافی پینے کے بعد صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا کہ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، میں بیڈ روم میں آرام کرنے کے لئے جا رہا ہوں۔

رات کا کھانا کھانے کے دوران وہ اور زیادہ پریشان ہو گیا جب اس کی بارہ سالہ بیٹی نے کہا کہ اسے آج اسکول میں کئی دفعہ کلاس میٹس نے طنز کر کے رُلا دیا۔ وہ کچھ

جواب دیتا کہ بیچ میں بیوی نے بھی یہ کہہ کر تشویش کا اظہار کیا کہ اسے بھی مارکیٹ میں شاپنگ کے دوران کئی مرتبہ بے رُخی کا سامنا کرنا پڑا اور اوپر سے میڈیا بھی خوف وہراس کا ماحول پھیلا رہا ہے۔

آفس میں ہتک آمیز سلوک، بیوی کی تشویش اور بیٹی کی نفسیاتی حالت دیکھ کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا کہ زہریلے ماحول کے اثرات ہر کسی کی نفسیات پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اچانک یہ سب کیسے ہوا اور ایک غیر جانبدار انسان ہونے کے باوجود انہیں کیوں ایسے حالات سے گزرنا پڑ رہا ہے..؟

اس نے جونہی جھیل کے پانی سے پیاس بجھانے کی کوشش کی تو تب ہی وہ پانی میں لاش کا عکس دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ پانی میں لاش کا عکس کیسے آ گیا۔ خوف کے مارے اس کا دل بیٹھنے لگا۔ جب وہ ہمت جٹا کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا تو لاش نے اسے اپنے قابو میں لے کر کس کے دبوچ لیا۔ اس نے لاش سے خود کو چھڑوانے کی بہت کوشش کی لیکن تھک ہار کر وہ بے بس ہو کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ لاش نے اب اپنا پھندا اس کی گردن میں ڈال دیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے اسی پیڑ تک لے گئی جس پر وہ خود لٹکی ہوئی تھی۔ وہ لاش سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز حلق سے باہر نہیں آ رہی تھی۔ اسے اب یقین ہو گیا کہ لاش اسے پیڑ پر لٹکائے گی اور وہ چند ہی لمحوں کے اندر مر جائے گا۔

سفید ہاتھیوں کے ٹھکانوں کو زمین بوس کر دیا گیا تھا۔ ماحول میں خوف ودہشت کی ہوائیں رقص کر رہی تھیں۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ شاطر لومڑیوں نے سفید ہاتھیوں کے ٹھکانوں کو مٹانے کی سازش ابابیلوں کے سر تھوپ دی اور سفید سلطنت کے ابرہہ کے اندر ابابیلوں سے بدلہ لینے کی سونامی جوش مارنے لگی۔ کالے ناگ، بندر اور گرگٹ بھی سفید ہاتھیوں کے ہمنوا بن گئے اور ابابیلوں کے گھونسلے سفید سونامی کی زد پر آ گئے۔

اچانک لاش نے اس کو پیڑ کے نیچے چھوڑ کر پھندا اپنی گردن میں ڈال دیا اور پیڑ پر دوبارہ لٹک گئی۔ وہ یہ ماجرا دیکھ کر حیران ہوا۔ حیرانی کے عالم میں ہی اسے لگا کہ سفید ہاتھیوں کی سونڈ سے نکلنے والے شعلے ماحول کو آتش زدہ بنا رہے ہیں اور فضاء میں پرواز کرتی ابابیلیں کنکروں کی بارش سے تباہی مچا رہی ہیں۔ رفتہ رفتہ پیڑ کی ٹہنیاں بھی شعلوں کی زد میں آ رہی ہیں اور لومڑیاں، بندر، ناگ اور گرگٹ بھی کنکروں کا نشانہ بن رہے ہیں۔

وہ یہ آتش انگیز صورتحال دیکھ کر سوچنے لگا کہ اس سفید و سبز جنگ کے شعلوں کو کسی نہ کسی طرح ٹھنڈا کرنا ہی پڑے گا اور وہ پانی پانی چلاتے ہوئے نیلی جھیل کی طرف دوبارہ چل پڑا۔

جھیل کے کنارے پہنچ کر یہ خوش نما نظارہ دیکھ کر اس کی آنکھیں خیرہ ہوئیں کہ نیلی جھیل کا شفاف پانی طلوع آفتاب کی سنہری کرنوں سے چمک رہا تھا۔

○○○

کالے دیوؤں کی واپسی

وہ گہری کھائی سے نکل کر جونہی پہاڑ کی بلند چوٹی پر پہنچا تو دھوپ بڑھنے کے ساتھ ساتھ پگھلتے گلیشر کی طرح یخ بستہ وجود بھی رفتہ رفتہ پگھلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد حواس بحال ہوتے ہی بے قرار آنکھیں گہری کھائی کے پگھلتے گلیشر کو تکنے لگیں۔ پانی کے بہاؤ کی طرح جیسے اس کی منجمد یادداشت بھی بہنے لگی اور وہ ماضی کو یاد کرنے لگا لیکن اسے ابھی کچھ یاد نہیں آ رہا تھا حتی کہ وہ اس گلیشر میں کتنے دنوں، برسوں یا صدیوں تک پڑا رہا۔ اس کی سوچ ابھی ان ہی گتھیوں کو سلجھانے میں الجھی ہوئی تھی کہ کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اسے احساس ہوا کہ شاید اب پہاڑ پر بھی بستی بس گئی ہے لیکن اس کا شبہ جلد ہی دور ہوا کیونکہ وہ جب کھڑا ہو کر گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا تو دور دور تک کہیں پر کسی بستی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ پھر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں؟ وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ اسے پہاڑ کے دامن میں بھیڑ بکریوں کا ایک بڑا ریوڑ نظر آیا۔ ریوڑ چوٹی کی جانب بڑھ رہا تھا اور دوپہر تک اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

ریوڑ کے نزدیک پہنچتے ہی وہ ایک بڑے پتھر کے پیچھے چھپ گیا۔ ریوڑ میں گھوڑے، خچر اور کتے بھی تھے۔ گھوڑے اور خچر ساز و سامان سے لدے ہوئے تھے اور ان کی لگامیں چند گڈریوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ گڈریوں میں بچے، جوان، عورتیں اور چند بوڑھے بھی تھے۔ بوڑھوں کا لباس تو روایتی انداز کا تھا لیکن بچوں اور جوانوں کے کپڑے کچھ نئے اسٹائل کے تھے۔

ریوڑ جب پہاڑ کے اوپر پھیل گیا تو ایک بزرگ نزدیکی چشمے پر پہنچ کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔اس نے پانی کے چند گھونٹ پی کر دوسرے لوگوں کو آواز دی کہ وہ یہاں آکر ٹھکانہ بنالیں۔نوجوانوں نے گھوڑوں اور خچروں سے سامان اتارا اور خیمے گاڑنے شروع کردیئے۔عورتوں اور بچوں نے پتھروں کے چولہے بنائے اور چشمے کے اردگرد زندگی کا آغاز ہوا۔ یہ سب دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ شاید یہ لوگ اسی وادی کے مکین ہیں۔سبھی لوگوں کو کام میں مشغول پا کر وہ دھیرے دھیرے بزرگ کی جانب بڑھنے لگا۔

بزرگ کے نزدیک پہنچ کر جب اس نے بزرگ سے بات کرنا شروع کی تو وہ حیران ہوا کہ بزرگ اس ویرانے میں کسی اجنبی کو دیکھ کر خوف زدہ ہوا اور نہ ہی اس کی کسی بات کی طرف دھیان دیا۔وہ یہ سوچ کر کہ شاید بزرگ کو صاف دکھائی نہیں دیتا یا بہرے پن کا شکار ہے، ایک نوجوان کی طرف بڑھ گیا۔لیکن یہاں پر بھی کسی قسم کی توجہ نہیں ملی۔ وہ تھوڑا سا پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا لیکن کوئی بھی اس کی موجودگی کی طرف دھیان نہیں دے رہا تھا۔ وہ ابھی اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ چند کتے بڑی تیزی سے بھونکتے بھونکتے اس کی جانب بڑھنے لگے۔وہ ڈر کر وہاں سے ہٹا اور گھبراتے ہوئے جھاڑیوں میں گھس گیا۔ کتے اس کو نظر انداز کر کے دوسری جانب کسی بھیڑئے کی طرف دوڑ پڑے۔وہ تھوڑی دیر تک کتوں کو دیکھتا رہا لیکن وہ یہ دیکھ کر دوبارہ حیران ہوا کہ جھاڑیوں میں گھسنے کے باوجود بھی اسے کسی قسم کی خراش تک نہیں آئی۔

غروبِ آفتاب کے بعد خیموں میں روشنی نمودار ہوئی۔ وہ جھاڑیوں سے نکل کر بزرگ کے خیمے میں داخل ہوا۔وہاں پر بزرگ کے اردگرد چھوٹے چھوٹے بچے اور چند نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔وہ بھی ایک طرف بیٹھ کر سوچنے لگا کہ وہ پھر بزرگ سے بات کرنے کی کوشش کرے، لیکن کئی بار اپنی بات دہرانے کے باوجود جب اسے کوئی توجہ نہیں ملی تو وہ خاموش ہو کر ہر چہرے کو تکنے لگا۔وہ لوگ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور پھر بچوں کے اصرار پر بزرگ نے کہانی سنانی شروع کی۔

''وہ ایک ایسی وادی تھی جو 'ستی سر' کہلاتی تھی۔ستی سر کی داستان صدیوں سے سینہ بہ سینہ سفر کرتی رہی...''

''ستی سر..؟'' ایک بچے کے منہ سے نکل پڑا۔

بزرگ بچے کی بات سن کر مسکراتے ہوئے کہانی آگے بڑھانے لگا۔

وادی کو 'ستی سر' اس لئے کہا جاتا تھا کہ ساری وادی میں پانی ہی پانی موجود تھا، جس کی وجہ سے لوگ کشتیوں میں رہائش پزیر تھے۔لوگوں کا زیادہ تر بسیرا مچھلیوں اور سبزیوں پر ہوتا تھا۔لوگ تو زندگی کے ایام گزارتے رہتے لیکن ان کو ایک مصیبت نے گھیر رکھا تھا۔صبح جب وہ بیدار ہوتے تو کسی نہ کسی گھر سے کسی بچے کے غائب ہونے کی منحوس خبر پھیلنے سے لوگوں کے درمیان تشویش کی لہر دوڑ جاتی۔ یہ سلسلہ وادی میں کئی دہائیوں سے جاری تھا۔لوگ تو اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لئے آہ و فریاد کرتے رہتے لیکن کالے دیوؤں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔وہ جب اور جس وقت چاہتے، رات کے اندھیرے میں گھروں میں گھس کر بچوں کو اٹھا لیتے۔

'ستی سر' اور کالے دیوؤں کا ذکر سنتے ہی اس کے اندر ایک عجیب سی ہل چل مچ اٹھی۔اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ستی سر کے کالے دیو اس کا پیچھا کر رہے ہیں اور وہ پہاڑ کی جانب بھاگا جا رہا ہے۔

بزرگ نے حقے سے تمباکو کا کش لیا اور تھوڑا کھانس کر اپنی بات جاری رکھی۔

''کالے دیوؤں کے عذاب سے چھٹکارا پانے کی کئی کہانیاں دہرائی جاتی ہیں جن میں ایک یہ بھی ہے کہ ایک دن حضرت سلیمانؑ کا خبری پرندہ 'ہدہد' وادی کے اوپر پرواز کر رہا تھا کہ وہ وادی کے خوبصورت نظاروں سے خوش ہوا لیکن جب اس نے ستم زدہ انسانوں کی فریاد سنی تو وہ سخت غمگین ہوا اور جا کر حضرت سلیمانؑ کو پوری داستان سنائی۔حضرت سلیمانؑ داستانِ غم سن کر وادی کی طرف روانہ ہو گئے اور کوہِ سلیمانی پر اپنا تخت سجا کر کالے دیوؤں کو اپنے دربار میں بلوایا۔سارے دیو ڈرے سہمے حاضر خدمت

ہوئے۔ حضرت سلیمانؑ نے لوگوں کو بھی بلوایا اور ان کی ساری دکھ بھری روداد سنی۔ دیوؤں کے سردار 'کش دیو' کو سزا کے طور پر حکم دیا گیا کہ وہ وادی کا سارا پانی نکال کر یہاں سے نکل جائے۔ کش دیو نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے یہ شرط رکھی کہ اس کی شادی پری 'میری' سے کروائی جائے۔ شرط منظور ہوئی اور کش دیو نے دریائے جہلم کے ذریعے سارا پانی نکال دیا اور پری 'میری' سے شادی کرکے وہاں کے لوگوں کو ستانا چھوڑ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب وادی کے لوگ مصیبت سے آزاد ہو گئے تو اس کی یاد میں وادی کا نام کشمیر پڑ گیا۔''

''دوسری کہانیاں کیا ہیں۔'' ایک بچے نے پوچھا۔

''دوسری کہانیاں پھر کبھی۔'' بزرگ حقے کا کش لیتے ہوئے بولا۔ ''لیکن کہا جاتا ہے کہ ڈل جھیل کے نزدیک پہاڑ کا نام تب کوہِ سلیمانی پڑ گیا۔''

بزرگ کی زبان سے کہانی سن کر وہ ششدر رہ گیا۔ اس کے اندر خیالات کا ایک طوفان سا اٹھنے لگا۔ وہ بیقراری سے صبح کا انتظار کرنے لگا اور صبح ہوتے ہی وہ جہلم کی طرف چل پڑا۔ وہ کئی گھنٹوں تک اوبڑ کھابڑ اور تنگ پگڈنڈیوں پر چلتے چلتے دریائے جہلم کے کنارے پہنچ گیا۔ اس پر بھوک و پیاس کا کوئی اثر نہ تھا۔ وہ صرف وادی کی گھٹن بھری فضا کے بارے میں سوچنے لگا۔ جہلم کے پانی پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جہلم کا پانی سرخ مائل ہو چکا تھا اور اس کے اوپر بچوں کی کٹی پھٹی لاشیں تیر رہی تھیں۔ اس کے اندر تشویشناک لہر دوڑ گئی اور قدم جہلم کے منبع کی جانب بڑھنے لگے۔ چلتے چلتے اسے ایک کنارے پر قبرستان دکھائی دیا، جہاں پر گمنام قبروں کے درمیان غائب شدہ بچوں کا سوگ منایا جا رہا تھا۔ قبرستان کے ساتھ ہی خوبصورت بچوں کی اندھی آنکھیں ستم کا رونا رو رہی تھیں۔ تھوڑا اور چلنے کے بعد نوجوانوں کی لاشیں پیڑوں پر لٹکی ہوئی تھیں اور عورتوں کے کاٹے گئے بال سانپوں کی طرح پانی پر رینگ رہے تھے۔

جہلم کے سارے ماحول میں کہرام بپا تھا۔

وہ یہ اندوہ ناک صورت حال دیکھ کر سوچنے لگا کہ وادی پر یہ کون سی آفت آن پڑی ہے کہ ہر آنکھ سے مایوسی کے آنسو ٹپک رہے ہیں اور ہر دل سے ماتم کی آہیں نکل رہی ہیں۔ یہاں کی فضا بھی تو ماتم کناں ہے اور یہاں کے خوبصورت نظارے بھی کالی دھند میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اس کے قدم دوبارہ دھندزدہ ماحول کا سراغ لگانے کے لئے منبع کی طرف اٹھنے لگے۔ چلتے چلتے وہ جب جہلم کے سرے تک پہنچ گیا تو یہ دیکھ کر خوف زدہ ہوا کہ سرے کے اوپر منہ کھولے غاروں سے خون کے فوارے ابل رہے ہیں اور بچوں کے خون آلود سروں اور جسموں کو پانی میں پھینکا جا رہا ہے۔ غاروں کے اندر سے چیخنے اور قہقہوں کی دہشت ناک آوازیں آرہی ہیں جو غار کے اوپر لٹکے جادوئی پردوں پر من پسند نگار خانے کی صورت میں تبدیل ہو رہی ہیں۔

وہ ابھی ان ہی وحشت ناک چیخوں اور رنگ برنگی تصویروں میں کھویا ہوا تھا کہ ایک بچہ غار سے روتے بلکتے باہر کی جانب بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے جونہی بچے کے پیچھے سے آگ کے شعلے چھوڑتے ہوئے ہیولوں کو دیکھا جو نقارہ بجاتے ہوئے بھاگتے بچے کو امن امن کی صداؤں سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے تو اس کے منہ سے دلخراش چیخ نکل پڑی کہ کالے دیو تو پھر واپس آ گئے ہیں اور چیخ کے ساتھ ہی سراسیمگی کے عالم میں اس کے قدم خود بخود دوبارہ کوہِ سلیمانی کی جانب اٹھنے لگے۔

○○○

دردِ کشمیر

دونوں بوڑھے میاں بیوی سیب کے باغیچے میں دن بھر زندگی کی تلخ وشیریں یادوں کی داستان سناتے سناتے دل کا بوجھ ہلکا کرتے رہتے تھے۔ یہ باغیچہ بستی کی بالائی زمین کی اوپری سطح پر ہے جہاں سے نظر دوڑاتے ہی کشمیر کا پورا نقشہ نظروں کے سامنے آتا ہے۔ایک طرح سے پورے کشمیر کا نظارہ ہو جاتا ہے۔ کشمیر تو ویسے بھی وادی کہلاتا ہے کیونکہ یہ چار جانب پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ باغیچے سے پوری وادی ایک گلدستہ کی طرح لگتی ہے، اسی لئے تو کشمیر کو جنّت کا نمونہ کہا جاتا ہے۔خضر بٹ نے جب چہار جانب نظریں دوڑائیں تو حسب معمول نزدیکی قبرستان پر نظر پڑتے ہی ایک ہوک سی دل سے اٹھی۔ بیوی نے دردانگیز ہوک کو محسوس کیا اور بولی:

''خضر بٹ، کتنی بار کہا ہے کہ اس قبرستان کی طرف مت دیکھو،خود کے ساتھ ساتھ مجھے بھی کرب میں ڈال دیتے ہو۔''

''صبر کرنے کے باوجود بھی میری نظریں خود بہ خود قبرستان کی طرف چلی جاتی ہیں۔''خضر بٹ مغموم لہجے میں کہہ اٹھا اور اسی کے ساتھ آنکھوں سے چند قطرے بھی ٹپک پڑے۔''اس میں تو ہمارا سرمایہ دفن ہے۔ بھلا اپنے سرمائے سے کون غافل ہو سکتا ہے خدیجہ بیگم۔''

''میں بھی کہاں غافل ہوں۔'' خدیجہ بیگم کی آنکھیں بھی آبدیدہ ہو گئیں۔ ''لیکن، ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ سینتالیس سے ہم لوگ اسی کرب میں مبتلا ہیں۔''

''جی، سچ تو یہی ہے۔ کہ سینتالیس نے جہاں ایک طرف ہندوستان اور پاکستان کو آزادی کی خوشخبری سنائی، وہیں دوسری جانب کشمیر کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے طوقِ غلامی میں جکڑ کر کرب کی زنجیریں پہنائیں۔''

خضر بٹ جو کہ خود بھی سینتالیس میں باشعور نوجوان تھا، نے اپنی بیوی، جو کہ قریباً ان کی ہم عمر تھی، کی غمزدہ آنکھوں میں جھانکا۔ جن میں درد کی سونامی نظر آرہی تھی۔ وہ سونامی جس نے ان کے دونو جوان بیٹوں کو نگل لیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ خدیجہ بیگم کا دل بھی اب صبر کرتے کرتے جیسے پتھر بن گیا ہے یا وہ مجھے اور ٹوٹنے سے بچانے کے لئے ایسا کر رہی ہے۔ ان آنکھوں میں اسے اپنے بیٹوں کے خوبصورت مسکراتے چہرے نظر آئے۔ ایک بیٹا کشمیر کی آزادی کی خاطر اپنی زندگی نچھاور کر چکا تھا اور دوسرا بیٹا کراس فائرنگ کی زد میں آکر ابدی نیند سو گیا تھا۔ لیکن بوڑھے والدین کے لئے دونوں بیٹوں کی جدائی کا کرب اندر ہی اندر کئی برسوں سے زہر کی طرح پھیل رہا تھا۔ وہ صرف سوچ سکتے تھے۔ کیونکہ سوچنے پر کسی جابر اور ظالم کا زور نہیں چلتا۔ سوچنا خود تک ہی محدود ہوتا ہے۔ ویسے بھی اب کشمیری صرف سوچ ہی سکتے ہیں۔ جب ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا ہو اور اندھیرے میں کالے دیوؤں کا زور چلتا ہو تو ریشم مزاج خرگوشوں کی آہیں تک دبا دی جاتی ہیں۔ خضر بٹ ایک تعلیم یافتہ فرد تھا جبکہ اس کی بیوی نے کچھ زیادہ نہیں پڑھا تھا۔ خضر بٹ نے قبرستان کی طرف دوبارہ نظریں دوڑائیں تو سوچنے لگا کہ قبرستان میں تو میرے ہی دو بیٹے دفن نہیں ہیں بلکہ اس میں تو سینکڑوں لوگ آزادی کے سپنے دل میں چھپائے سو رہے ہیں۔ کالے دیوؤں نے کتنے ہی کشمیریوں کو موت کی نیند سلا دیا۔

خدیجہ بیگم کی آواز اسے قبرستان کے عالم سے واپس لائی، جو پوچھ رہی تھی کہ آپ تو ریڈیو اور ٹی وی پر خبریں سُن کر کہتے ہیں کہ دنیا ہمارے دکھ درد پر ضرور غور کرے گی اور کشمیر پھر سے جنّت بن جائے گا۔ خضر بٹ یہ سُن کر اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہنے لگا کہ بھروسہ تو اللہ پر ہی ہے، ہاں اگر اس نے ہم پر نظرِ عنایت فرمائی تو ضرور دنیا بھی ہمارے

حق میں بولے گی۔لیکن اس کے بعد وہ سوچ میں پڑ گیا کہ دنیا سے آس بھری امیدیں ہم سینتالیس سے لگائے بیٹھے ہیں لیکن اقوامِ متحدہ جیسا امن، آزادی اور جمہوریت کا علمبردار ادارہ بھی سفید کرگسوں کی اڑان کے مطابق ہی اپنے فیصلے سناتا رہتا ہے،نہیں تو ہمارا حل طلب مسئلہ بھی برسوں سے اس کے انصاف کا منتظر ہے۔

''جی...'' خدیجہ بیگم راحت کی سانس لیتی ہوئی بولی۔''امید تو اللہ سے ہی باندھ رکھی ہے۔''

تھوڑی دیر کے لئے دونوں خاموش رہے۔خضر بٹ اٹھ کھڑا ہوا اور ایک پیڑ سے چند خوبصورت سیب توڑ کر لایا۔دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی۔خدیجہ بیگم نے چاقو سے سیب کو کاٹا اور ایک قاش خضر بٹ کو دے کر دوسری خود کھانے لگی۔خضر بٹ کھاتے کھاتے خوشگوار موڑ میں بولا کہ شادی کے وقت سے آپ کی یہ عادت مجھے پسند ہے کہ جب بھی میں سیب لاتا ہوں تو آپ خود اپنے ہاتھ سے مجھے کھلاتی ہیں اور یہ عادت بچوں میں بھی تھی کہ جب تک ماں انہیں اپنے ہاتھ سے سیب نہیں دیتی تھی تب تک وہ دونوں نہیں کھاتے تھے۔اگر کبھی آپ کہیں گھر سے باہر ہوتیں تو جب میں انہیں کہتا کہ پتہ نہیں ماں کب آئے گی، آپ لوگ سیب کھالیں تو وہ دونوں کہتے کہ ہمیں ماں کے ہاتھ سے لئے بغیر سیب کھانے میں مزہ نہیں آتا ہے۔یہ سنتے ہی خدیجہ کی آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں اور وہ تھوڑی دیر سوچ میں پڑ کر بولی کہ آپ مجھے قبرستان میں لے کر اپنے بیٹوں کی قبروں کی زیارت کرائیں۔خضر بٹ یہ سن کر تھوڑا تذبذب میں پڑ گیا تاہم کئی دنوں سے وہ بھی قبرستان میں فاتحہ پڑھنے کے لئے نہیں گیا تھا اور خدیجہ کا ہاتھ تھام کر دونوں باغیچے سے نکلے اور بالائی سے اترتے ہوئے قبرستان کے گیٹ تک پہنچ گئے۔

اسی دوران قبرستان سے ایک ہمسایہ اور ایک چھوٹی بچی نکل رہے تھے۔علیک سلیک کے بعد ہمسائے نے بتایا کہ بچی آج صبح سے والد کے قبر کی زیارت کرنے کے لئے اصرار کرتی رہی، اس لئے اس کے دل کے سکون کے لئے قبرستان چلے آئے۔ان

کے چلے جانے کے بعد خضر بٹ افسوس کرتے ہوئے بولا کہ ان کے باپ کو مارنے کے باوجود کالے دیوؤں کا پیٹ نہیں بھرا اور اس خوبصورت بچی کو کالج سے لوٹتے وقت پیلٹ کا نشانہ بنایا جس کے زہریلے چھروں نے اس کے خوبصورت چہرے کی خوبصورتی چھین لی اور آنکھوں کی روشنی سے محروم کر کے عمر بھر کے لئے اپاہج بھی بنا دیا۔

اسی دوران دونوں بچوں کی قبروں کے نزدیک پہنچ گئے۔ خدیجہ بیگم پہلے بڑے بیٹے کی قبر کے سرہانے تھوڑی دیر تک ٹھہری اور پھر چھوٹے بچے کی قبر کے سرہانے بیٹھ گئی۔ قبروں کو دیکھتے ہی اس کے سامنے بچوں کے چہرے گھومنے لگے اور کانوں میں آوازیں گونجنے لگیں کہ ماں ہمیں جلدی سے کھانا دے دیں، نہیں آج پہلے ہمیں سیب کھلائیں...! خدیجہ بیگم پر عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ خضر بٹ نے جب ان کی یہ حالت دیکھی تو انہوں نے آنکھیں بند کر کے فاتحہ پڑھنا شروع کیا۔ خدیجہ بیگم آنسو بہاتے بہاتے آمین کرتی رہیں۔ خضر بٹ ابھی فاتحہ پڑھ ہی رہے تھے کہ اسے محسوس ہوا آمین آنے کی آواز بند ہوگئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور جلدی جلدی فاتحہ مکمل کر کے خدیجہ بیگم کو آواز دینے لگا لیکن خدیجہ بیگم چھوٹے بیٹے کی قبر کے سرہانے دردِ کشمیر کے ساتھ ابدی نیند سو گئی تھیں۔

ooo

اصلی روشنی

سویرا ہوتے ہی مارکیٹ اور کالونی کے گلی کوچوں کی صفائی ستھرائی شروع ہو جاتی ہے۔ مقامی لوگ جب دودھ روٹی خریدنے کے لئے بازار کی طرف جاتے ہیں تو صفائی کرمچاری صفائی کرتے اور کوڑا کرکٹ اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ کام کرنے والوں میں بچے، بوڑھے اور جوان سبھی ہوتے ہیں۔ بچے بوڑھے میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوتے ہیں لیکن بیشتر جوانوں کا ڈریس صاف ہوتا ہے، اگرچہ جھاڑو دیتے ہوئے ان کے کپڑوں پر بھی داغ دھبے لگ جاتے ہیں تاہم وہ پھر بھی صاف ہی نظر آتے ہیں۔ پہلے پہل مقامی لوگ جب پاس سے گزرتے تھے تو بزرگ صفائی کرمچاری بڑے ادب سے آداب بجالاتے تھے لیکن اب کم ہی لوگ اس رسم کو نبھا رہے ہیں۔ نوجوان ہاتھ میں جھاڑو سنبھالے سر جھکا کر اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور کام کے دوران ہیڈ فون کی جھنکار انھیں جھاڑو چلانے کے ساتھ ساتھ سر ہلانے تک ہی مست رکھتی ہے۔ ایک آدھ گھنٹے کے بعد جمعدار نمودار ہوتا ہے اور ان لوگوں کو ٹھیک طرح سے کام کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے دو چار گالیاں بھی سنا دیتا ہے۔ کچھ نوجوان گالیاں بڑی مشکل سے سہتے ہیں۔

اس برادری میں ادھیڑ عمر کا ایک صفائی کرمچاری بھی ہے۔ کالونی کے بچے اسے صفائی چاچا کے نام سے پکارتے ہیں اور کالونی میں وہ اسی نام سے مشہور بھی ہے۔ وہ جب بھی کسی صحن میں صفائی کرنے کے لئے قدم رکھتا ہے تو صفائی کرتے کرتے بلند آواز سے گھر والوں کا حال چال بھی پوچھتا رہتا ہے۔ وہ کئی برسوں سے اس گلی کی صاف صفائی

کرتا آیا ہے۔ اس گلی کے ارد گرد کالونی کے بڑے بڑے لوگ رہتے ہیں۔ اس وجہ سے صفائی چاچا کے کچھ ساتھیوں کے دل جلتے رہتے ہیں۔ کئی مرتبہ ان لوگوں نے صفائی چاچا کو وہاں سے ہٹانے کی کوشش بھی کی لیکن صفائی چاچا کی محنت اور خوش اخلاقی کی وجہ سے بااثر لوگوں کی مداخلت نے حاسدوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ لوگ صفائی چاچا سے یونہی خار نہیں کھاتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ صفائی چاچا جس گلی کی صفائی کرتا ہے وہ کام ان کے حصے میں آئے تاکہ ان کا آنا جانا بھی بڑے لوگوں کے گھروں میں بڑھ جائے۔ صفائی چاچا بچپن سے ہی اس گلی کی صفائی کرتا آیا ہے۔ گلی کے لوگوں سے اس کی جان پہچان ضرور تھی لیکن اس کے باوجود اس نے کبھی بھی کسی لالچ کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ گلی پوری کالونی میں خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہاں ایسے بڑے بڑے مشہور لوگ رہتے ہیں جو زندگی کے مختلف شعبہ جات میں بڑا نام رکھتے ہیں۔

کئی برسوں سے شہر طوفانی ہواؤں کی زد پر تھا۔ جوانی میں جب صفائی چاچا سویرے کام پر نکلتا تھا تو وہ بلا خوف وڈر کے گنگناتے ہوئے گلی کی صفائی کرتا رہتا تھا لیکن اب کام پر نکلتے وقت اس پر عجیب سا خوف طاری رہتا ہے بلکہ یہ خوف تو اب سارے لوگوں کی سوچ کا حصہ بن چکا ہے۔ ایک دن گلی کی صفائی کرتے کرتے وہ جب نکڑ پر پہنچا تو وردی پوش اہلکار نے آواز دے کر اسے اپنے پاس بلالیا۔ وہ ڈر کے مارے فوراً قریب آگیا۔ اہلکار نے بندوق سے سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا کہ جلدی جلدی خون کے دھبوں پر پانی پھیر دو۔ سڑک پر خون کی ایک لکیر پھیلی ہوئی تھی۔ دھبوں کو دیکھ کر اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اہلکار سے خون کے بارے میں پوچھے لیکن پھر خوف کی وجہ سے بالٹی ہاتھ میں اٹھا کر خون کے دھبوں پر خاموشی کے ساتھ پانی پھیرنے لگا۔ سڑک صاف کرنے کے بعد وہ تیز قدموں گلی میں واپس مڑا۔ وہ کافی مایوس تھا۔ صبح صبح خون کے دھبے صاف کرنے کے علاوہ مایوسی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے بیٹے کی بینائی روز بہ روز کم ہو رہی تھی۔

اس کے آپریشن کے لئے ایک لاکھ روپے کی ضرورت تھی۔ اپنی خستہ حال برادری کی طرح وہ بھی خستہ حال تھا۔ اس کے لئے تو دس ہزار کا انتظام کرنا بھی مشکل تھا، ایک لاکھ کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ تین کمرے والے چھوٹے سے کچے مکان میں اپنی بیوی بچے سمیت رہتا تھا۔ اس کا لڑکا نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس کی برادری کے کم ہی بچے اسکول جاتے تھے لیکن تعلیم یافتہ گھرانوں سے میل ملاپ کے باعث وہ بھی اپنے لڑکے کو تعلیم یافتہ بنانے کا شوقین تھا مگر بچے کی گھٹتی بینائی سے وہ اتنا پریشان ہو رہا تھا کہ اسے اپنا شوق پورا ہوتا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

کامریڈ بابو کے صحن میں داخل ہوتے ہی وہ لان کی صفائی میں جٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد کامریڈ بابو صحن میں چہل قدمی کرتے کرتے اسے پوچھ بیٹھا کہ آج کیوں دیر ہو گئی؟

''سڑک پر خون کے دھبے صاف کرنے میں دیر ہو گئی۔'' صفائی چاچا سلام کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''شاید کوئی بندہ مارا گیا ہو گا۔''

''جب تک استحصال ہوتا رہے گا، ایسے حادثات ہوتے رہیں گے۔'' کامریڈ بابو اپنا کامریڈی فلسفہ جھاڑنے لگا۔ ''اس لئے ہم لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہماری تحریک کا ساتھ دیں تا کہ دولت مندوں سے غریبوں کا حق چھینا جا سکے اور سماج میں انصاف کا ماحول پروان چڑھ جائے۔''

صفائی چاچا کئی برسوں سے کامریڈ بابو کا یہ فلسفہ سنتا آیا ہے اور بڑی معصومیت سے سوچتا رہتا ہے کہ وہ کامریڈ بابو کی تحریک کا ساتھ دے کر کون سا انقلاب لا سکتا ہے۔ اس نے آج تک کسی امیر کو غریب ہوتے نہیں دیکھا لیکن کئی غریب پڑھ لکھ کر اچھا کام دھندا کر کے خوشحال ضرور بن گئے۔ یہ سوچتے سوچتے صفائی چاچا کی نظر صحن میں کھڑی ایک اور نئی کار پر پڑی۔ وہ کامریڈ بابو سے پوچھ بیٹھا کہ نئی گاڑی کب لائے؟ کامریڈ بابو بڑے فخر سے کہنے لگا کہ چھوٹا لڑکا اب کالج جانے والا ہے۔ وہ اپنی گاڑی میں کالج جانا چاہتا ہے۔

''ٹھیک ہے بابو۔'' صفائی چاچا پہلی گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بول پڑا۔''تمہارے گھر میں تو ایک گاڑی پہلے سے ہی تھی۔''

''اچھا، تمہارا بیٹا کس کلاس میں پڑھتا ہے؟'' کامریڈ بابو بات ٹالتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

''وہ تو نویں میں پڑھتا ہے۔'' صفائی چاچا مایوس لہجے میں بول پڑا''لیکن..!''

''لیکن کیا..؟''

''اس کی آنکھوں کی روشنی کم ہو رہی ہے۔علاج کے لئے ایک لاکھ روپے درکار ہیں۔میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔بس یہی پریشانی اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔''

''ہاں یہ تو بہت پریشانی والی بات ہے۔'' کامریڈ بابو افسوس ظاہر کرتے ہوئے بول پڑا۔''میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں نہیں تو میں تمہاری مدد ضرور کرتا۔''

صفائی چاچا نے دوبارہ نئی گاڑی کی طرف دیکھا اور کوڑا کرکٹ بالٹی میں بھر دیا اور اٹھا کر باہر کوڑا دان میں ڈال کر پاس والے صحن میں داخل ہو گیا۔این۔جی۔او کا صدر کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔صفائی چاچا صفائی کر کے سلام کہتے ہوئے اسٹول پر بیٹھ گیا۔صدر اس کو اخبار کا فوٹو دکھاتے ہوئے بڑے سکون سے کہنے لگا کہ دیکھو چاچا جب انسان غریبوں کے لئے خلوص سے کچھ کرتا ہے تو کوئی بھی تعریف کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔اس اخبار میں میری آرگنائزیشن کی رپورٹ میری فوٹو کے ساتھ چھپی ہے۔سرکار نے ہماری آرگنائزیشن کو اس سال قومی ایوارڈ کے لئے بھی چنا ہے۔

''مبارک صاحب۔'' صفائی چاچا بڑی محبت سے بول پڑا''آپ سچ مچ غریبوں کی مدد کرتے رہتے ہیں۔''

''شکریہ، شکریہ۔'' صدر نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔''اچھا تمہارا بیٹا اب کیسا ہے؟ تم نے کہا تھا کہ اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔''

''ہاں کل میں ڈاکٹر کے پاس گیا تھا اس نے ٹیسٹ دیکھ کر کہا کہ آپریشن کرنا پڑے گا جس کے لئے ایک لاکھ روپے کا خرچہ آتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئی صفائی چاچا کی آنکھیں آبدیدہ ہوگیں۔

این۔جی۔او صدر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اسے دلاسا دینے لگا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں لیکن میں تمہیں ایک مشورہ دوں گا جس سے تمہاری مشکل بھی حل ہوسکتی ہے۔

''کون سامشورہ؟'' صفائی چاچا بیتابی سے پوچھ بیٹھا۔

''ہمارے سنٹر کے پچھواڑے تمہاری جو تھوڑی بہت زمین ہے وہ سنٹر کے نام کردو۔'' صدر اسے سمجھانے لگا۔''میں آپریشن کا سارا خرچہ دوں گا اور سبھی سے کہوں گا کہ تم نے یہ زمین سنٹر کو مفت میں دے دی۔''

صفائی چاچا تھوڑی دیر سوچنے کے بعد یہ کہتے ہوئے وہاں سے نکل پڑا کہ وہ کل جواب دے گا۔

صفائی چاچا اب نامے دادا کے صحن میں صفائی کرنے لگا۔صفائی کرتے کرتے وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ صدر کے مشورے پر عمل کرے یا نہ کرے۔اسی دوران نامے دادا کے ورکر نے اسے آواز دے کر اندر بلالیا۔صفائی چاچا اندر جا کر سیدھا نامے دادا کی بیٹھک میں چلا گیا۔دادا نے اسے چائے پلانے کے بعد کہا۔

''چاچا۔۔!الیکشن کے دن قریب آرہے ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ اس بار موقع ہاتھ سے نہیں جانا چاہیے کیونکہ پچھلی بار میں اسمبلی الیکشن میں بہت کم ووٹوں سے ہارا تھا۔''

''صاحب!میں تو آپ کو ہی ووٹ دیتا ہوں اور برادری کے لوگ بھی آپ کے ساتھ ہی ہیں۔''

صفائی چاچا بڑے ادب کے ساتھ بول پڑا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن مخالف پارٹی والے بڑے ظالم ہیں۔'' دادا کہنے لگا،'' یہ

لوگ کوئی بھی چال چل سکتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ ہم بھی ایسا داؤ کھیلیں کہ اگلے الیکشن میں جیت ہماری ہو۔''

''جناب، میں نے اپنے اور اپنی برادری کے ووٹ کے بارے میں آپ کو بتا دیا۔ اس میں آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''اچھا وہ جو اپنے بچے کا آپریشن کرانا تھا۔'' دادا ہمدردی کے لہجے میں پوچھنے لگا۔ ''اس کے لئے کچھ انتظام ہوا کہ نہیں؟''

''اس بارے میں ابھی سوچ ہی رہا ہوں۔ ابھی تک پیسوں کا انتظام نہیں ہو سکا۔''

''اچھا اچھا۔'' دادا سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''کوئی بات نہیں، تم پارٹی کے لئے کچھ کر کے دکھاؤ تمہارے بچے کا آپریشن میرے ذمہ، اور ہاں کل سویرے یہاں ضرور آنا۔''

''بہت مہربانی دادا۔'' کہتے ہوئے صفائی چاچا وہاں سے نکل پڑا۔

دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ جب صفائی چاچا گھر واپس لوٹا تو بیوی چائے سامنے رکھتے ہوئے پوچھ بیٹھی کہ پیسوں کا کچھ انتظام ہوا کہ نہیں، تم نے کہا تھا کہ میں کسی سے مشورہ کروں گا؟

صفائی چاچا نے صدر اور نامے دادا کی باتیں بتا دیں۔ بیوی نے یہ سن کر کہا کہ زمین تو ہمارے پاس اتنی ہی ہے، وہ بھی بیچ دیں گے تو سبزی کہاں سے اگائیں گے۔ میرے خیال میں نامے دادا کی بات اچھی ہے، کم سے کم زمین تو بچ جائے گی۔ اس کی بات ضرور ماننا۔

وہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں، کہتے ہوئے اس کی نظر اپنے بچے پر پڑی جو لالٹین کی روشنی میں کتاب کھولے بیٹھا تھا۔

''کتنی بار تجھ سے کہا کہ کتابیں مت پڑھا کر۔'' صفائی چاچا اسے سمجھانے

لگا۔ ''ڈاکٹر بابو نے بھی تم سے کہا ہے۔ جب نہ ٹھیک ہو جاؤ تو...''

''مجھے ضرور پڑھنا ہے۔'' بیٹے نے بات کاٹتے ہوئے غصے سے کہا۔ ''میرا آپریشن جلدی کرواؤ تا کہ میں امتحان دے سکوں۔''

''ہاں وہی مشورہ کر رہا ہوں بیٹا۔'' باپ نے نرم لہجے میں کہا۔

صفائی چاچا بستر پر دیر تک سوچتا رہا کہ دادا کی بات ماننی پڑے گی۔ زیادہ سے زیادہ کہیں پر جھنڈا لگانا پڑے گا یا الیکشن ریلی میں جانا پڑے گا۔ یہ کوئی مشکل کام تو ہے نہیں۔

صبح سویرے ہی وہ نامے دادا کے گھر پہنچ گیا اور کام کے بارے میں پوچھ بیٹھا۔ دادا خوش ہو کر اسے سمجھانے لگا کہ آج بازار والی پارک میں مخالف پارٹی کا جلسہ ہونے والا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ جلسہ ناکام ہو جائے۔

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' صفائی چاچا بے قراری سے پوچھنے لگا۔

''وہ تمہیں میرا ورکر بتا دے گا۔'' دادا نے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کام بڑی ہوشیاری سے کرنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔'' صفائی چاچا یہ کہتے ہوئے ورکر کے ساتھ باہر نکل گیا۔

ورکر نے اسے گاڑی میں بٹھا کر سبزی منڈی پہنچا دیا۔ وہاں اس نے موبائل پر کسی سے بات کی اور تھوڑی دیر میں ایک آدمی ان لوگوں کے پاس آ گیا۔ ورکر نے صفائی چاچا کو اس کے ساتھ جانے کے لئے کہا۔ دونوں ایک بلڈنگ کے اندر چلے گئے۔ صفائی چاچا اس آدمی کے حلیہ سے حیران سا ہوا۔ اس کے سر پر پگڑی تھی، ماتھے پر ٹیکہ اور چہرے پر خط نما داڑھی تھی۔ اس آدمی نے ایک تھیلا اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا کہ اسے جلسے والی جگہ پر زمین کے اندر چھپا کے رکھ دینا اور ایک ڈبہ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے سمجھانے لگا کہ اس ڈبے میں پیچھے سے یہ بیٹری لگا دینا اور جلسے کے دوران تھوڑا دور رہ کر یہ سرخ بٹن دبا دینا۔ دو تین مرتبہ سمجھانے کے بعد جب وہ آدمی مطمئن ہوا

تو وہ صفائی چاچا کا برین واش کرنے لگا کہ یہ بڑا اچھا کام ہے کیونکہ ظلم ظالموں کے مٹانے سے ہی مٹتا ہے۔ ہر مذہب میں ظالم کو سزا دینے کی بات بتائی گئی ہے۔ تم بھی یہ کام کر کے اپنے ملک کے لئے اچھا کرو گے۔

صفائی چاچا یہ دیکھ کر تھوڑا سا پریشان ہو گیا لیکن بچے کا آپریشن اور بیوی کی بات یاد آتے ہی اس نے ریموٹ جیب میں ڈالا اور تھیلا ہاتھ میں اٹھا کر واپس گاڑی میں آ گیا۔ ورکر نے اسے مین چوک میں ڈراپ کیا اور وہ بالٹی اٹھا کر پارک کی طرف چل پڑا۔ پارک میں پہنچ کر اس نے ادھر ادھر نظریں گھمائیں۔ پارک سنسان پڑا تھا۔ اس نے تھوڑی سی زمین کھودی، اس میں تھیلا چھپا دیا اور ایک بڑا پتھر اس کے اوپر رکھ دیا۔ یہ کام کرنے کے بعد وہ گلی میں واپس آ گیا اور صفائی کا کام کرنے لگا۔ جھاڑو دیتے دیتے وہ اندر سے خوش ہو رہا تھا کہ یہ کام ہو جانے کے بعد اس کے بیٹے کا آپریشن ضرور ہو جائے گا، لیکن ظلم کے خاتمے والی بات وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ پھر وہ خود کو تسلی دینے لگا کہ سمجھانے والے کے حلیے سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی نیک اور دردمند آدمی تھا۔ اس کی بات صحیح ہو سکتی ہے۔ اسے نامے دادا کی طرح الیکشن جیتنے کا لالچ تو نہیں ہے۔ وہ صرف ظلم کو مٹانے کی بات کر رہا تھا۔ خیر اس کام سے ملک کا بھلا بھی ہو گا اور آپریشن کے لئے پیسہ بھی ملے گا۔

دن چڑھنے کے ساتھ ساتھ مارکیٹ میں لوگوں کی چہل پہل بڑھنے لگی۔ پارک میں جلسے کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ لوگ جمع ہو رہے تھے۔ جھنڈے چڑھائے جا رہے تھے۔ منسٹر کے آتے ہی نعرے بلند ہونے لگے۔ نعرے سنتے ہی صفائی چاچا پارک کے نزدیک آ گیا اور جلتے کوڑا کرکٹ کے پاس جھاڑو بالٹی لے کر بیٹھ گیا۔ وہ بیچ بیچ میں گتے کے ڈبے آگ میں ڈالتا رہا تا کہ ڈیوٹی پر مامور پولیس اسے مشکوک نظروں سے نہ دیکھیں۔ منسٹر مائیک پر دھواں دار تقریر کر رہا تھا اور اس کے سپورٹر درمیان میں نعرے لگا رہے تھے۔

صفائی چاچا نے جیب سے ریموٹ نکالا اور اس میں بیٹری لگا دی۔ بیٹری لگانے کے بعد اس نے ریموٹ کو واپس جیب میں ڈال دیا اور جلسہ گاہ کی طرف دیکھنے لگا۔ جلسہ گاہ میں بچے بوڑھے اور جوان سبھی موجود تھے۔ اس نے دوبارہ ریموٹ کنٹرول جیب سے نکالا اور سرخ بٹن پر نظر ڈالی۔ سرخ بٹن پر نظر پڑتے ہی اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ ریموٹ والا ہاتھ تھر تھرانے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا...

دھماکہ سے اٹھنے والے گرد و غبار نے سارے گرد و پیش کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ چیخ و پکار سے کہرام مچ اٹھا۔ ہر طرف لاشوں کے ٹکڑے بکھر گئے۔ ایمبولنسوں کے چیختے سائرن سے کان پھٹنے لگے۔ مٹی کے ریزے اس کی آنکھوں میں گھس گئے...

وہ آنکھیں میچتے میچتے سوچنے لگا کہ شاید وہ آنکھوں کی روشنی سے محروم ہو گیا ہے۔ وہ آنکھیں رگڑ رگڑ کر پارک کی طرف دیکھنے لگا تو دھندلی سی روشنی میں اس نے دیکھا کہ پارک لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ منسٹر تقریر کر رہا ہے اور لوگ اچھل اچھل کر اس کے حق میں نعرے لگا رہے ہیں۔ یہ خوفناک خیالات آتے ہی صفائی چاچا کے وجود کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے ریموٹ سے بیٹری نکالی اور یہ کہتے ہوئے ریموٹ کو جلتے کوڑا کرکٹ کے شعلوں میں پھینک دیا کہ

”اس روشنی سے میرے بچے کا اندھیرا ہی اچھا ہے۔“

○○○

مشترکہ میراث

"گلستان پر سیاہ بادل کیوں چھائے ہوئے ہیں..؟"

آسمان کی طرف دیکھتے ہی اس کا ذہن کئی الجھنوں کا اسیر ہوجاتا تھا۔ کہیں یہ میری آنکھوں کا ہی تو کوئی نقص نہیں ہے لیکن مجھے تو ہر چیز صاف دکھائی دیتی ہے۔ پھر صبح سویرے آسمان کی طرف دیکھتے ہی مجھے کیوں یہ سیاہ بادل رقص کرتے نظر آتے ہیں؟ کہیں یہ میرا وہم تو نہیں ہے؟ نہیں، نہیں! وہم کا تو میں عادی نہیں ہوں۔ پھر یہ اندھیرا میرے سوا کسی کو کیوں نہیں دکھائی دیتا ہے؟ اس تناؤ سے کچھ حد تک اسی وقت وہ چھٹکارا پاتا تھا جب خود کو دلاسہ دیتا کہ جب انسانی شعور پر سیاہ رنگ چڑھ جاتا ہے تو وہ روشنی کی پہچان کھو بیٹھتا ہے۔ سرد ہوا کا جھونکا آتے ہی اس نے کھڑکی بند کردی۔ ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے وہ دیوار پر آویزاں گھڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ گھڑی کی سوئیاں اشارہ کررہی تھیں کہ دفتر کے لیے نکلنے کا وقت ہورہا ہے۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ کچن میں چلا گیا اور ٹفن بیگ میں ڈال کر چل پڑا۔

بس اسٹاپ پر تھوڑی دیر انتظار کر کے وہ بس پر چڑھ گیا اور حسبِ عادت دفتری ٹائم سے چند منٹ پہلے دفتر پہنچ گیا۔ کمرے میں ایک دو ملازم موجود تھے۔ ان سے علیک سلیک کر کے وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ سامنے والے ٹیبل پر دفتری فائلوں کا گٹھا موجود تھا۔ ٹیلیفون کے علاوہ ایک ٹیبل ٹیگ پر S.O رقم تھا۔ تھوڑی دیر سستانے کے بعد وہ ایک فائل کھول کر چیک کرنے لگا۔

''ایس ۔او۔صاحب۔'' دھیمی آواز سن کر اس نے چپراسی کی طرف دیکھا۔
''بڑے صاحب اسکول بلڈنگ کی فائل منگوا رہے ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' کہتے ہوئے وہ فائل ہاتھ میں اٹھا کر بڑے صاحب کے چیمبر میں چلا گیا۔ چیمبر میں صاحب کے علاوہ بلڈنگ کا ٹھیکیدار بھی موجود تھا۔ فائل صاحب کے سامنے رکھنے کے بعد وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ بڑے صاحب نے فائل پر سرسری نظر ڈال کر پوچھا کہ سلامت علی اس فائل کو ابھی تک پاس کیوں نہیں کیا ہے؟

''سر، اس بلڈنگ کے تعلق سے ایک شکایتی لیٹر موصول ہوا ہے۔''

''شکایتی لیٹر؟'' ٹھیکیدار کے منہ سے نکل پڑا۔

''ہاں شکایتی لیٹر۔'' ایس۔او اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''جب تک نہ متعلقہ محکمے سے کلیئرنس رپورٹ آئی گی تب تک یہ فائل پاس نہیں ہوسکتی ہے۔''

''جناب، یہ ان لوگوں کی کارستانی ہے جنہیں یہ ٹھیکہ نہیں ملا تھا۔'' ٹھیکیدار صفائی پیش کرنے لگا۔

''تو پھر آپ کلیئرنس لائیے نا'' ایس۔او بڑی نرمی سے سمجھانے لگا۔ ''میں ایک گھنٹے میں فائل پاس کردوں گا۔''

''آپ لوگ کیوں آپس میں الجھ رہے ہیں۔'' بڑے صاحب بیچ میں بول پڑے۔ ''مجھے بھی بات کرنے کا موقع دو۔''

''ٹھیک ہے جناب۔'' دونوں یک زبان ہوکر بول پڑے۔

''دیکھو ٹھیکیدار صاحب، شکایت تو موصول ہوئی ہے۔'' افسر اسے سمجھانے لگا۔ ''اب ایک کام کیجئے کہ سلامت علی کے لئے چائے پانی کا کچھ انتظام کیجئے، باقی میں خود دیکھ لوں گا۔''

''چائے پانی۔'' ایس۔او حیران ہوکر افسر کی طرف دیکھتے ہوئے بول پڑا۔

''جناب، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔'' افسر مصنوعی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہنے لگا۔'' ویسے بھی آپ نے مکان بنوانے کے لئے جی۔پی۔فنڈ کے لئے اپلائی کیا ہے۔ فائل تو ابھی آفس میں ہی ہے۔''

''جناب' یہ اچھا مشورہ ہے۔'' ٹھیکیدار خوش ہو کر بول پڑا۔''میں ایس۔او۔ صاحب کے مکان کے لئے نصف خرچہ بصورت اینٹیں، سیمنٹ اور لوہا بلا معاوضہ دوں گا۔بس آپ جلدی سے یہ فائل پاس کریں تاکہ میں رُکے پڑے بیس پچیس لاکھ نکال سکوں۔''

بے ایمانی کی اس سودا بازی کے درمیان سلامت علی کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کے ضمیر کو گرم گرم سلاخوں سے داغا جا رہا ہو۔وہ بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پا کر اٹھ کھڑا ہوا اور 'کلیئرنس رپورٹ کے بغیر فائل میرے ٹیبل سے پاس نہیں ہو سکتی'، کہتے ہوئے چیمبر سے نکل پڑا۔

کرسی پر بیٹھ کر اس نے سامنے پڑے گلاس کو اٹھایا اور اپنے خشک گلے کو تر کرنے لگا۔پانی پینے کے بعد بھی وہ بڑی بے چینی سے فائلوں کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ اپنی بیس برس کی سروس میں اس نے کبھی بھی اپنے فرض سے غفلت برتنے کی کوشش نہیں کی اور اب سروس کے ان آخری برسوں میں وہ کام کیوں کروں جس سے میری آخرت برباد ہو جائے۔چھٹی کے بعد وہ مارکیٹ سے سبزیاں اور بیوی کی دوائیاں خرید کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔

گھر پہنچ کر اس نے بیوی کو سبزیاں اور دوائی پیکٹ دیتے ہوئے تاکید کی کہ میں نے چند دنوں کی چھٹی لے لی ہے،کل صبح سرکاری اسپتال جائیں گے،وہاں پر ٹیسٹ وغیرہ کرانے پڑیں گے اس لئے صبح کو کچھ نہیں کھانا۔بیوی نے اثبات میں سر ہلا کر سبزی اور دوائی الماری میں رکھ دیئے اور چولھا جلاتے ہوئے کہنے لگی کہ اب کپڑے بدلو، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔

مطلع ابر آلود تھا۔کئی مہینوں کی خشک سالی کے بعد بارش پڑنے کے امکانات واضح نظر آرہے تھے ۔صبح کی چائے پینے کے بعد سلامت علی نے بچوں کو سمجھایا کہ شاید انہیں اسپتال میں چند دن ٹھہرنا پڑے گا اس لئے گھر کا خاص خیال رکھیں ۔ یہ کہہ کر دونوں میاں بیوی اسپتال کے لئے روانہ ہو گئے۔

دو ڈھائی گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد جب گاڑی نے انہیں اسپتال کے گیٹ پر ڈراپ کیا تو موسلا دار بارش ہو رہی تھی ۔سلامت علی بیوی کو او۔ پی ۔ڈی میں بیٹھا کر ٹکٹ لانے چلا گیا۔وہاں پر کافی بھیڑ تھی ۔دس بیس منٹ کے بعد وہ ٹکٹ لایا اور بیوی کو ساتھ لے کر کارڈیالوجی سیکشن میں چلا گیا۔وہاں پر تین چار ڈاکٹر مریضوں کا چیک اپ کرر ہے تھے ۔آٹھ دس منٹ کے بعد سلامت علی نے ٹکٹ کے ساتھ ساتھ پرانے ٹیسٹ رپوٹس اور نسخے بھی ایک ڈاکٹر کے سامنے رکھ دیئے ۔ڈاکٹر نے تمام کاغذات چیک کر کے اپنے سینئر کو دکھائے ۔سینئر ڈاکٹر میڈیکل رپوٹس چیک کرتے ہوئے کہنے لگا کہ اتنا نقصان پیشنٹ کو بیماری سے نہیں پہنچا ہے جتنا کہ غیر معیاری میڈیسن کھانے سے پہنچا ہے، خیر گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے ۔میں یہ ٹیسٹ لکھ کر دیتا ہوں ۔انہیں کروا کر آج ہی مجھے دکھانا۔

سلامت علی بیوی کو لے کر ٹیسٹ سنٹر چلا گیا اور ایک گھنٹے کے بعد دوبارہ ڈاکٹر کے پاس رپوٹس لے کر حاضر ہوا۔ڈاکٹر نے رپوٹس دیکھ کر انہیں بتایا کہ اس کو ایڈمٹ کرنا پڑے گا اور تین چار دن کے بعد اس کی ہارٹ سرجری کرنی پڑے گی ۔اس کے لئے تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے خرچہ آئے گا۔ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب کہتے ہوئے سلامت علی بیوی کو لے کر وارڈ میں چلا گیا۔وہاں پر الاٹ شدہ بیڈ نمبر پر بیوی کو بٹھایا اور تھوڑی دیر اسٹول پر بیٹھ کر وہ نسخہ لے کر دوائی لانے کے لئے جب اٹھنے لگا تو بیوی مایوس لہجے میں پوچھنے لگی:

’’اتنے پیسوں کا انتظام کیسے ہوگا‘‘

''تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ اللہ کوئی نہ کوئی سبیل ضرور نکالے گا۔'' سلامت علی اسے دلاسہ دینے لگا۔ ''ویسے بھی ان ہی دنوں میں میرے جی۔ پی۔ فنڈ کی رقم اکاونٹ میں جمع ہو جائے گی۔''

''لیکن وہ تو آپ نے مکان بنوانے کے لئے نکالی ہے۔'' بیوی پھر سے بول پڑی۔ ''اگر اس میں سے اتنے پیسے میرے علاج پر ہی خرچ ہو گئے تو پھر...''

''وہ میرا کام ہے۔'' سلامت علی بیوی کی بات کاٹتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اس وقت مکان سے زیادہ تمہارا علاج کروانا ضروری ہے اور بس کچھ بھی نہیں۔''

اتنا کہنے کے بعد سلامت علی ضروری دوائیاں لانے کے لئے میڈکل شاپ کی طرف چل دیا۔

دو تین دن گزر گئے۔ بارش کا زور دن بہ دن بڑھ رہا تھا۔ دریا اور ندی نالوں میں پانی کی سطح تشویشناک حد تک بڑھ رہی تھی۔ آس پاس کے سبھی باندھ آہستہ آہستہ ٹوٹنے شروع ہو گئے۔ شہر کے گلی کوچے پانی سے بھر گئے۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن سے اعلانات ہو رہے تھے کہ سیلابی خطرات کے پیش نظر لوگ محفوظ مقامات کی طرف پناہ لینے کے لئے جانا شروع کریں۔ لوگوں نے ان اعلانات کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی کیونکہ ماضی کے تجربات دیکھ کر سبھی یہی سمجھتے رہے کہ پچھلی کئی دہائیوں سے شہر میں ایسا کوئی بڑا سیلاب نہیں آیا ہے کہ لوگ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے ہوں۔ لیکن جب شہر کے اوپر سیلابی آفت ٹوٹ پڑی تو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ سیلاب کے زوردار ریلے ڈیڑھ ڈیڑھ منزل تک چڑھ گئے۔ کئی لوگ اپنی جان گنوا بیٹھے۔ ہزاروں مال مویشی پانی میں ڈوب گئے۔ سیلاب نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ گھر گھر ویرانی چھا گئی۔ دکانوں میں اربوں کا مال مٹی بن گیا۔ لوگ مکان کی تیسری چوتھی منزلوں پر کئی دنوں تک بے آب ودانہ کس مپرسی کی حالت میں کسی غیبی مدد کی آس میں سسکتے رہے۔ سارا مواصلاتی نظام ٹھپ پڑ گیا۔ ہر طرف نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا

کہ قدرت نے دہائیوں کے بعد شہر پر آبی قہر برسایا ہو۔ اسپتال کی پہلی منزل میں جب پانی گھُس گیا تو اسپتالی عملہ نے بیماروں کو تیسری منزل پر پہنچا دیا۔ بارش نہ رُکنے کی وجہ سے ہنگامی صورت حال پیدا ہوگئی۔ سرکار کی طرف سے اسپتال میں پھنسے لوگوں کو ائیر لفٹ کر کے دوسرے اسپتالوں میں لے جانے کی شروعات ہوئی۔

سلامت علی اور اس کی بیوی کو بھی ایک اسپتال میں پہنچایا گیا۔ ہوائی سروس کے ذریعے دوسرے شہروں سے میڈیسن اور میڈیکل اسٹاف لایا گیا۔ سرکار کی طرف سے اعلان ہوا کہ تمام بیماروں کا علاج معالجہ مفت کرایا جائے گا۔ یہ خبر سن کر سلامت علی کی بیوی کے چہرے پر رونق سی آگئی۔ اسے آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ سلامت علی تھیٹر سے باہر بڑی بے قراری سے چہل قدمی کرنے لگا۔ ایک دو گھنٹے گزرنے کے ساتھ ہی سلامت علی کی بیوی کو آپریشن کے باہر والے وارڈ میں شفٹ کیا گیا۔ سلامت علی نے بیوی کا چہرہ دیکھ کر راحت کی سانس لی اور اسٹول پر آرام سے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر دم لینے کے بعد سلامت علی نے کھڑکی کھولی۔

بارش تھم چکی تھی۔ موسم خوش گوار ہو رہا تھا۔ وہ آسمان کی طرف بار بار دیکھ رہا تھا۔ وہاں مطلع صاف دکھائی دے رہا تھا۔ نہ کہیں سیاہ بادل رقص کرتے نظر آرہے تھے نہ اس کے ذہن میں کوئی تناؤ موجود تھا۔ فضا کو صاف وشفاف دیکھ کر وہ سوچنے لگا کہ آج کا سیلاب ہماری بداعمالیوں کی سزا ہے۔ ہر طرف لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ ہر مقام پر انصاف کا خون ہو رہا تھا۔ لوگ رشوت خوری، بے ایمانی اور بددیانتی کرنا اپنا کرتب سمجھتے تھے۔ ان ہی غیر انسانی کرتوت دیکھ کر قدرت نے بارش کی صورت میں ہم پر قہر برسایا تاکہ ہمیں سدھرنے کا موقعہ مل جائے۔

سیلاب کی تباہ کاری نے شہر کی ہیت ہی بدل ڈالی تھی۔ زندگی کی گاڑی پھر سے رفتار پر آنے لگی تھی۔ ماحول میں کافی بدلاؤ آرہا تھا۔ سلامت علی کی نظریں فائل پر جمی ہوئی تھیں۔ چپراسی نے یہ کہتے ہوئے اسے آواز دی کہ نئے صاحب آپ کو بلا رہے

ہیں۔ سلامت علی فائل بند کر کے نئے افسر کے پاس چلا گیا۔

''آپ سے مل کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔'' کہتے ہوئے نئے افسر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''جب میں نے یہاں پر جوائن کیا تھا تو آپ چھٹی پر تھے اور اوپر سے سیلاب نے بھی سارا نظام درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ اس وجہ سے آپ سے بالمشافہ ملاقات نہ ہو سکی۔''

''جی سر۔'' سلامت علی سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''سیلاب کے علاوہ دراصل مجھے کچھ ذاتی پرابلم بھی تھی۔''

''خیر' انسان کو تو مشکلات کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔'' افسر نے ایک کاغذ اس کو دیتے ہوئے کہا۔

''یہ دعوت نامہ قبول کیجیے۔''

''دعوت نامہ۔'' سلامت علی نے کاغذ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''جی' دعوت نامہ۔'' افسر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ''آپ کو 'ایمپلائی اپریسیئشن ڈے' پر بلایا گیا ہے۔''

''لیکن سر یہ سب کیسے ہوا؟'' سلامت علی دعوت نامہ پڑھنے کے بعد پوچھ بیٹھا۔

''یہ اپنی محنت کا پھل ہے۔'' افسر اسے مبارکباد دیتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اس میں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے۔''

سلامت علی نے افسر کا شکریہ ادا کیا اور دعوت نامہ جیب میں ڈال کر چیمبر سے نکل پڑا۔ فنکشن کے دن دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ وہ بھی وقت پر ٹاؤن ہال میں پہنچ گیا۔

فنکشن ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہال میں زندگی کے مختلف شعبہ جات سے وابستہ افراد موجود تھے۔ ایوان صدارت میں بڑے بڑے سرکاری عہدیداران موجود تھے۔ تقریب بڑے خوش گوار ماحول میں شروع ہوئی۔ ہر مقرر اس تقریب کے

مقاصد واہمیت اور ملازمین کی فرض شناسی ، ایمان داری ، عوامی خدمت وغیرہ کی سراہنا کر رہا تھا۔ تقاریر کے بعد تقسیم اعزازات کا سلسلہ شروع ہوا۔ بہت سارے افراد کو ان کی بہترین کارکردگی کے اعتراف میں اعزازات سے نوازنے کے بعد ڈائس سے سلامت علی کے نام کا اعلان ہوا۔ سلامت علی ڈائس پر حاضر ہوا اور مائیک کے سامنے پُر مسرت انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگا:

''میں ان سبھی افراد کو مبارک باد پیش کرتا ہوں جنہیں آج کی اس پُر وقار تقریب میں اعزازات کے لئے چنا گیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ میں ان تمام معزز شخصیات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میری کارکردگی کے اعتراف میں مجھے آج اس ایوارڈ کا مستحق قرار دیا۔ مجھے یہ ایوارڈ ایمان داری کی بنیاد پر دیا جارہا ہے۔ ایمان دار افراد کے کے حق میں یہ ایک قابل ستائش ایوارڈ ہے۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، انسانیت سب انسانوں کی مشترکہ میراث ہے اور انسانیت کے اس گلستان کی رونق حق شناسی ، ایمان داری ، انصاف پروری ، دیانتداری ، فرض شناسی وغیرہ جیسے خوب صورت پھولوں سے ہی نکھر جاتی ہے، اس لئے ہم سب کو اس گلستاں کے خوشبودار پھول بن کر دکھانا ہے، ایسا ہونے پر بحیثیت اشرف المخلوقات ہمارے لئے یہی سب سے بڑا اشرف ہوگا، ایوارڈ ہوگا۔ یہی خواب آنکھوں میں سجائے ہوئے میں ایوارڈ لئے بنا ایک بار پھر آپ سبھی معززین کو محبت بھرا شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

ان کلمات کے ساتھ ہی سلامت علی واپس اپنی نشست پر اطمینان سے بیٹھ گیا اور پورا حال دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا۔

○○○

کالا چوہا

حصارِ وقت کے چکرویو میں پھنس کر زخمی روح کا سفر اب اُس جھیل کے کنارے پر آن پہنچا تھا جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہاں پر بے چین روح کو تسکین ملتی ہے۔ برفیلی پہاڑیوں سے آرہی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں فضا کو خوشگوار بنا رہی تھیں۔جھیل کے نیلگوں پانی پر نظر پڑتے ہی طبیعت پر بھی خوشگوار احساس چھا گیا اور شیریں پانی کے ٹھنڈے گھونٹ حلق سے اترتے ہی گرم بھٹی برف خانہ بن گئی۔شیریں پانی سے پریشان وجود میں راحت کی مٹھاس پھیلتے ہی وہ پاؤں پسار کر سبزے پر دراز ہوا۔سوچ کے پروں کو چوہے نے کترنا چھوڑ دیا۔یہ چوہا لمبے عرصے سے ان پروں کو کترتا آیا تھا۔مدت سے وہ بے خوابی کا شکار ہو چکا تھا کیونکہ آنکھیں بند کرتے ہی چوہا سکون کے بل میں گھس کر سوچ کے پروں کو کترنا شروع کر دیتا تھا۔ پروں کی کتر بیونت سے دماغ تو پریشانی کا جنگل بن گیا تھا۔اس پریشانی کے جنگل سے تنگ آ کر وہ اکثر سوچتا رہتا کہ نہ جانے یہ چوہا اس کے احساس پر کیسے مسلط ہوا۔اس نے تو کتر کتر کر اُس کی سوچ کو ویران کھنڈر بنا دیا۔شیریں پانی کی مٹھاس سے راحت پانے کے ساتھ ساتھ خوشیوں کی شہنائی بج اٹھی۔

''کتنے ٹرک آئے ہیں؟''

''سر، پانچ سو ٹرک چاول کے اور ایک سو آٹے کے۔''

کلرک کی بات سنتے ہی اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''انچارج افسر سے کہو کہ وہ راشن گھاٹوں کی لسٹ بنا کر چاول روانہ کرے اور

ایک حصہ چوہوں کے کھاتے میں ڈالے۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' کہتے ہوئے کلرک انچارج افسر کے چیمبر کی طرف چلا گیا۔

ڈائریکٹر صاحب کا حکم سنتے ہی انچارج افسر ہنستے ہوئے بول پڑا کہ ہاں بھئی لسٹ تو بنانا ہی پڑے گی، آخر ہم سرکاری خدمت گار جو ٹھہرے، پر اس بات کا کیا کریں، ہمارے گھروں میں بھی تو چوہے پڑے ہیں۔ان کے کھانے پینے کا بھی تو انتظام کرنا پڑتا ہے۔

''جی جناب۔'' کلرک نے فائل میز پر رکھتے ہوئے کہا۔''افسر لوگوں کا حساب کتاب بھی افسری طرز کا ہوتا ہے۔لیکن ہم جیسے چھوٹے لوگوں کے پیٹ میں بھی تو چوہے دوڑتے رہتے ہیں، ان کی دوڑ دھوپ کا بھی خیال رکھئے گا۔''

''ارے بھئی، سرکاری راشن آتا ہی ہے پیٹ بھرنے کے لئے۔چلو اب لسٹ بنانے کی تیاری کریں۔''

''آپ ہمیشہ میری بات کو ٹالتے رہتے ہیں۔'' بیوی گاڑی سے نئی کالونی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''آج تک تو صرف آپ کے حکم پر ہی چلتا آیا ہوں، اب ٹالنے والی کون سی بات بیچ میں آن پڑی؟''

''ہمارے سارے رشتہ دار شہر کی اس نئی کالونی میں شفٹ ہو گئے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ کون سی بات...؟''

''وہ مجھے بھی معلوم ہے، میری وزیرِ خزانہ۔''

''تو پھر آپ کچھ کیوں نہیں کرتے..؟ اپنے سب لوگ پوچھتے رہتے ہیں کہ ڈائریکٹر صاحب کب کالونی میں بنگلہ خریدیں گے؟''

''جی، پہلے تو پیسوں کا کچھ انتظام ہونے دو۔کالونی میں تو بنگلہ پچاس لاکھ سے کم نہیں ملتا ہے۔حال ہی میں تو منّے کی ڈاکٹری سیٹ کے لئے تیس لاکھ ڈونیشن دینے

پڑے، اب پیسہ کمانا چھومنتر کا کام تو نہیں ہے۔"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے، اب گاڑی کو پارک کرو، ادھر مارکیٹ میں تازہ سبزی خریدنی ہے۔"

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ زندگی بھی خوشحال ہوتی چلی گئی۔ اب کالونی میں عالی شان گھر بھی تھا اور صحن میں کئی شاندار گاڑیاں بھی موجود تھیں۔ اس کی خوشحالی کا جب بھی کہیں پر ذکر ہوتا تو وہ سن کر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کہتا کہ سب مالک کا کرم ہے۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے ساتھ ہی وہ سوچتا رہتا کہ اب تو زندگی کی ہر آسائش موجود ہے، اس لئے عمر کا باقی حصہ بڑے سکون سے گزرے گا۔ دن میں کبھی وہ صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھتا رہتا اور کبھی گارڈن میں جا کر اخبار اور کتابیں پڑھتا رہتا۔ لیکن دن ختم ہوتے ہی سکون بھرے وجود پر بے قراری کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ نہ تو ٹی وی دیکھنے کا شوق باقی رہا اور نہ ہی کوئی کتاب پڑھنے میں لطف باقی رہا۔ وہ جب نیند کے لئے بستر پر لیٹ جاتا تو نیند آتے ہی پریشانی کے جنگل میں چوہے کی دوڑ شروع ہو جاتی اور ساری رات کروٹیں بدل بدل کر بیقراری کے عالم میں کٹ جاتی۔

جب کافی عرصے تک یہی حالت رہی تو اس کے مزاج میں چڑ چڑا پن آنے لگا۔ وقت بے وقت کی یہ چڑ چڑاہٹ سبھی گھر والوں کو پریشان کر رہی تھی۔ ایک دن جب اس نے دبے لفظوں میں اپنی بے خوابی کے بارے میں ڈاکٹر بیٹے کو بتایا تو اس نے سوتے وقت گولیاں کھانے کا مشورہ دیا۔ گولیاں تو وہ کھانے لگا لیکن ان کا الٹا اثر یہ ہوا کہ اب وہ دن کا چین بھی کھو بیٹھا اور پریشانی کا بُت بن کے دن بھر گارڈن میں گم سُم بیٹھا رہتا۔ گھر والے بھی اس کی بدمزاجی کو بڑھتی عمر کا تقاضا سمجھ کر نظر انداز کرنے میں ہی عافیت سمجھتے رہے۔

ایک رات وہ اچانک بستر سے اٹھ کر بک شلف کو کھنگالنے لگا۔ وہ بڑی بے قراری سے کسی کتاب کو ڈھونڈ رہا تھا۔ کافی دیر تک کتابوں کو اُلٹ پُلٹ کر کے جب اُس کی نظر

طلسماتی جھیل پر پڑی تو اُس کا چہرہ خوشی سے کھِل اُٹھا۔اس کتاب میں طلسماتی جھیل کی وہ داستان موجود تھی جو اُس نے بچپن میں اپنے بزرگوں سے سنی تھی۔وہ دیر تک داستان پڑھتا رہا۔داستانی ماحول کے طلسم کا اسیر ہو کر وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔اُس نے خواب میں خود کو جھیل کے کنارے پر پایا۔وہاں پر بہت سارے لوگ موجود تھے۔وہ لوگوں کے چہروں کو بڑے غور سے دیکھتا رہا۔اُسے کچھ چہرے جانے پہچانے سے نظر آئے۔لوگوں کے قدم جھیل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ایک آدمی نے جب جھیل میں دو تین ڈبکیاں ماریں تو وہ کنارے پر بیٹھ کر بڑی بے تابی سے پانی میں اُس آدمی کا عکس دیکھنے لگا۔پانی میں خوبصورت عکس دیکھ کر وہ اُس پہچان والے چہرے کو دوبارہ تکنے لگا۔وہ چہرہ پُرسکون لگ رہا تھا۔وہ سوچنے لگا کہ خوب صورت عکس خیر کی نشانی ہے۔اس کے بعد بہت سارے لوگ جھیل میں نہاتے رہے لیکن کوئی بھی اپنے پانی والے عکس سے مطمئن نظر نہیں آ رہا تھا۔پانی کے اندر کہیں پر سانپ ہی سانپ رینگ رہے تھے تو کہیں پر گدھے، بلیاں دوڑ رہے تھے۔ایک اور جان پہچان والے نے جب پانی میں ڈبکی ماری تو وہ اُس کا عکس دیکھ کر لرز اٹھا۔پانی کے اوپر انسان کھڑا تھا لیکن پانی کے اندر کتے کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔اپنے عکس کو پانی میں دیکھ کر اُس آدمی کے چہرے پر وحشت سی چھا گئی۔اُس آدمی کے چہرے کو دوبارہ دیکھتے ہی اُسے یاد آیا کہ یہ آدمی عمر بھر دوسروں کے حق پر ڈاکہ ڈالتا رہا تھا۔لوگوں کی نظروں میں بھی اُس کی سماجی حیثیت لالچی کتّے سے کچھ زیادہ نہ تھی۔خواب کے بھیانک مناظر سے اُس کی نیند اُچٹ گئی اور صبح ہونے کے انتظار میں وہ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔

جھیل کے شیریں پانی کی مٹھاس جب ختم ہو گئی تو چوہے کی کتر کتر سے وہ سبزے سے اُٹھ بیٹھا۔عبادت گاہ سے مالک کائنات کی تعریفیں بلند ہو رہی تھیں۔وہ عبادت گاہ میں داخل ہو گیا۔ہر طرف مسحور کُن صدائیں گونج رہی تھیں۔آنکھوں سے ندامت کے آبشار برس رہے تھے۔ہر کوئی اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔اس مسحور کن منظر

سے اُس کا دل پسیج گیا۔آنکھوں سے ندامت کے آنسو ٹپکنے لگے۔چوہے کی کتر کتر بند ہوگئی۔محراب پر ایک بزرگ کی خوش کُن آواز گونج اٹھی:

''مالک کائنات غفور ورحیم اور ربُ الکریم ہے۔وہی کائنات کا اصلی بادشاہ ہے۔وہی گناہوں کا معاف کرنے والا ہے۔یہ جھیل کرموں کی جھیل ہے۔اس میں چھوٹے چھوٹے گناہ دُھل جاتے ہیں اور بڑے بڑے گناہوں کا عکس پانی میں دکھائی دیتا ہے۔اس لئے انسان کو اپنے اصلی مالک کی ہدایت پر چل کر اپنے کرموں کا خیال پہلے سے ہی رکھنا چاہئے۔آپ لوگ جھیل میں ڈبکیاں مار کر تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر دینا۔پھر آنکھ کھولتے ہی جس کا جو عکس پانی میں دکھائی دے گا وہی اُس کے کرموں کا پھل ہوگا۔''

لوگ عبادت گاہ سے نکل کر جھیل کی طرف بڑھنے لگے۔ہر آنکھ ندامت کے آنسوؤں سے تر تھی۔وہ بھی آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے جھیل میں اتر گیا۔لوگ ڈبکیاں مارتے چلے گئے اور جھیل کے اندر مختلف عکس ابھرتے رہے۔جھیل کا ماحول بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔اس بھیانک منظر سے اُس کی روح کانپ اُٹھی۔خوف کی وجہ سے وہ ڈبکی مارنے سے ڈر رہا تھا۔کافی دیر تک پانی میں کھڑا ہو کر وہ پریشانی کے عالم میں سوچتا رہا کہ کیا معلوم اُس کے کرموں کا عکس کیا آئے گا۔پھر یہ سوچ کر اُس نے پانی کے اندر ڈبکیاں ماریں کہ شاید اُسے اندر کے روحانی کرب سے نجات مل سکے۔ڈبکیاں مار کر جونہی اُس کی نظر پانی میں اپنے عکس پر پڑی تو اُس کے منہ سے وحشت ناک چیخ نکلی...''کالا چوہا۔''

ooo

ماحول بچاؤ

(مکالماتی افسانہ)

آدم زاد کے قدموں کی آہٹ محسوس کرتے ہی سارا جنگل سائیں سائیں کرنے لگا۔ خوف کے مارے پیڑ پودوں کی جان ہی نکل رہی تھی۔ آدم زاد کے کلہاڑے کی ضرب جب معصوم بوٹے کے تنے پر پڑی تو نوجوان بوٹوں کی چیخ پکار سے بوڑھے دیودار اور کائیرو کی مضبوط شاخیں بھی خوف سے لرز اٹھیں۔ آدم زاد کے بے رحم ہاتھوں سے جنگل کا صفایا ہوتے دیکھ کر جنگل کے چرند و پرند بھی دُکھی ہو رہے تھے کیونکہ انہیں بھی اپنے ٹھکانے ختم ہوتے نظر آ رہے تھے۔ کلہاڑے کی دہشت ناک آواز سے کائیرو پر بیٹھی مینا کا دل غم سے ڈوبتا جا رہا تھا۔ دیودار پر بیٹھے طوطے نے جب مینا کی پریشان صورت دیکھی تو وہ اس خطرے کو ٹالنے کے بارے میں سوچتے ہوئے مینا سے گفتگو کرنے لگا:

طوطا : تم کیوں بغل میں چونچ دبائے مایوس بیٹھی ہو؟

مینا : تمہیں کیا موسم کی تبدیلی کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔

طوطا : احساس کیوں نہیں ہے۔ اس جھلستی گرمی نے ہمارے کتنے ہی ہم جنس مار ڈالے، مگر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔

مینا : وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں، لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔

طوطا : یہ انسان کتنا لالچی بن گیا ہے۔ سارا ماحول بگاڑنے پر تلا ہوا ہے۔

مینا : ہاں اب تو اس پولیوشن میں سانس لینی بھی مشکل ہو رہی ہے۔

طوطا : سانس ہی کیا، جب سے اس نے جنگلوں کا بے دریغ کٹاؤ شروع کر دیا

ہے۔تب سے موسم بھی آگ برسا رہا ہے۔

مینا : اور پانی بھی ختم ہو رہا ہے۔

طوطا : ہاں، لیکن کچھ نہ کچھ تو سوچنا پڑے گا۔

مینا : وہی تو میں کہہ رہی ہوں۔

طوطا : وہ دیکھو، کبوتر آ رہا ہے۔اسی سے پوچھتے ہیں۔اچھا مشورہ دیتا ہے۔

مینا : ہاں ٹھیک ہے۔

طوطا : رُکورُکو کبوتر بھائی۔تم سے ایک مشورہ کرنا ہے۔

کبوتر : اچھا ٹھیک ہے، بتاو۔

طوطا : ویسے تو آپ کو بھی معلوم ہے کہ انسان کے ہاتھوں ماحول خراب ہو رہا ہے۔اس لئے انسان کو سمجھانے کا کوئی طریقہ بتاؤ تاکہ وہ جنگل کاٹنے سے بھی رُک جائے اور نئے پیڑ بھی لگائے۔

کبوتر : بے شک یہ انسان اب اتنا لالچی اور ناسمجھ بن گیا ہے کہ جنگلوں کا صفایا کرتے ہوئے یہ بھی نہیں سوچتا ہے کہ پیڑ پر کلہاڑی چلانا خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی چلانے کے برابر ہے۔

طوطا : جی کبوتر بھائی، آپ نے صحیح کہا لیکن ہمیں تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا کیونکہ ہم بھی تو اسی ماحول میں سانس لیتے ہیں۔ماحول صاف رہے گا تو ہماری زندگی بھی خوشحال رہے گی۔

کبوتر : جی ٹھیک ہے طوطا چاچا۔میں اکثر انسانوں کی بستی میں ہی رہتا ہوں۔ کچھ نہ کچھ سوچتا ہوں۔

مینا : تو جلدی سوچو کبوتر راجا، تاکہ ہم سب کے ساتھ ساتھ انسان کا بھی بھلا ہو سکے۔

کبوتر : مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے۔

مینا : ہاں بولو بولو۔

کبوتر : ہمیں کوّے سے بھی مدد لینی پڑے گی۔

طوطا : کس لئے؟

کبوتر : وہ جنگل سے ایک چھوٹا بوٹا اٹھائے گا اور میرے ساتھ بستی چلے گا۔

مینا : اس سے کیا ہوگا۔

کبوتر : ہم روز انسان کے صحن میں بوٹے لے کر جائیں گے اور جونہی اس کا چھوٹا بیٹا صحن میں کھیلنے کے لئے آئے گا تو کوّا گڑھا کھودنا شروع کرے گا اور میں بوٹا لگا دوں گا۔

طوطا : کیا اس طرح سے وہ تمہارا مقصد سمجھ پائے گا۔

کبوتر : جی وہ میرے بہت سے اشارے سمجھتا ہے اور مجھے روز دانے بھی ڈالتا ہے۔ جب ہم کئی دن تک یہی کام کریں گے تو وہ سمجھ جائے گا اور شاید انسان پھر سے پیڑ اُگانا شروع کر دیں۔

طوطا : ہاں یہ ترکیب ٹھیک رہے گی۔ امید پر ہی تو دنیا قائم ہے۔

مینا : اب جلدی کوّے کو بلاؤ تا کہ ہمارا ماحول پھر سے ٹھیک ہو جائے۔ نہیں تو زمین سے زندگی ختم ہو جائے گی۔

کبوتر : میں جاتا ہوں اور کوّے کے ساتھ مل کر یہ نیک کام شروع کروں گا۔

طوطا : جاؤ، کام جلدی شروع کرنا، اگر ہماری بھی ضرورت پڑے تو بتا دینا۔

مینا : ہاں میری بھی دعائیں ساتھ رہیں گی۔

تھوڑی ہی دیر میں کبوتر اور کوّا چونچ میں بوٹے لئے بستی کی جانب پرواز کر رہے تھے اور طوطا مینا خوشی سے اپنے پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ پرندوں کے اس ماحول بچاؤ مشن سے جنگل کے مایوس پیڑ پودوں کی شاخیں بھی خوشی سے جھوم اٹھیں۔

کبوتر اور سانپ

گلی سے بانسری کی دردناک آواز سنتے ہی اس کے سمندرِ دل میں ارتعاش پیدا ہوا۔ دماغ میں جذبات کی لہریں اٹھنے لگیں اور پاؤں سونامی کی رفتار سے گھر کی دہلیز پار کرتے ہوئے بانسری بجانے والے کے سامنے آکر ٹھہر گئے۔

پیر دانا پتھر پر بیٹھا آنکھیں بند کیے پرسکون انداز سے بانسری بجا رہا تھا۔ اس کے کاندھے پر خوبصورت کبوتر بیٹھا تھا۔

بانسری کے اداس سُر نوجوان کے دل میں اُتر رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بانسری اس شہرِ بدحواس کا مرثیہ سنا رہی ہے۔

بانسری کی آواز دھیرے دھیرے دھیمی ہونے لگی۔

مرثیہ ختم ہونے کے بعد پیر دانا نے اپنی روشن آنکھیں کھولیں۔

نوجوان کے کانوں میں ابھی بھی بانسری کی آواز گونج رہی تھی۔

نوجوان کے شکیل چہرے کو دیکھ کر پیر دانا کے ہونٹوں پر تبسم پھیلا اور اس کے ملائم لہجے نے نوجوان کو اپنی طرف متوجہ کیا:

''اے خوب رو نوجوان! آپ کی جوان سوچ کس طوفان میں پھنس چکی ہے جو آنکھیں بند کر کے ساحل کی تلاش میں سرگرداں نظر آ رہے ہو۔ تمہاری جھیل سی آنکھوں میں یہ ویران جزیرہ کیوں دکھائی دیتا ہے؟''

پیر دانا کے ملائم لہجے کی ٹھنڈک نوجوان کے دل کو راحت پہنچا گئی اور اس کے

گلابی لہجے سے شہد بھری شکایت درآئی:

''اے بانسری کے سُر میں اس شہرِ بدحواس کا مرثیہ سنانے والے پیر دانا..! اس بدحواسی کی کیا وجہ ہے؟''

اس قسم کا سوال پیر دانا کے سامنے کسی نے پہلی بار رکھا تھا۔ وہ اطمینان کی سانس لیتے ہوئے سوچنے لگے کہ برسوں سے بانسری بجانے کا نتیجہ آج سامنے آیا۔ ایک سرد آہ لیتے ہوئے وہ گویا ہوئے:

''انسانوں کے دماغوں میں نفرت کے سانپ رینگ رہے ہیں اور دل انسانیت کی زرخیز مٹی سے خالی ہوکر پتھر بن چکے ہیں۔ اب یہ بدحواس ہوکر زندگی کی دوڑ میں دوڑے جارہے ہیں۔''

نوجوان یہ خوفناک راز سن کر پوچھ بیٹھا:

''شہر کی اس بدحواسی کا اب کیا علاج ہے؟''

''بس.. دماغوں سے نفرت کے سانپوں کو نکال کر دل میں محبت کے کبوتر بساؤ۔''

یہ کہہ کر پیر دانا پتھر سے اٹھ کر بانسری بجاتے بجاتے چل دیا اور نوجوان کی ویران آنکھیں پتھر کے نیچے سے سانپوں کو نکلتے ہوئے دیکھ کر چمک اٹھیں، کیونکہ اب پتھر کے اوپر سفید کبوتر بیٹھا تھا۔

ooo

وفادار پیڑ

(مزاحمتی افسانہ)

''میرے دیش واسیو! ہمارا دیش ابھی مہان نہیں بنا ہے۔اپنے دیش کو مہان بنانے کے لئے ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔'' خواب گر سیاسی نیتا قومی سطح کے سیاسی جلسے میں سیکڑوں لوگوں کے سامنے شعلہ بیان تقریر کرر ہا تھا۔'' پچھلے پچاس ساٹھ ورشوں سے دیش کا ایک اہم اور باعزت طبقہ امتیازی برتاؤ کا شکار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ہمیں گاندھی جی کے خواب کو پورا کرنا ہے تو ملک کی اس بڑی اقلیت کو پورا سمان دینا ہوگا، جبھی ہمارا دیش مہان دیش کہلائے گا۔''

''صدر صاحب.. اتنی کوشش کے باوجود بھی ہمارا ووٹ بینک کچھ ڈھیلا سا دکھائی دے رہا ہے۔'' ایک ممبر پارٹی میٹنگ میں اظہار خیال کرنے لگا۔'' ہماری نظریں اقلیتی ووٹ پر تھیں، لیکن ان کا رجحان مخالف پارٹیوں کی طرف زیادہ نظر آرہا ہے۔''

''اگر اس طبقے کا سپورٹ ہمیں نہیں ملا۔'' ایک اور ممبر جذباتی انداز میں بول پڑا۔'' تو الیکشن میں پارٹی کی پوزیشن خراب ہوسکتی ہے۔''

''یہ طبقہ نرمی سے نہیں ماننے والا' ان کی عقل سٹھیا گئی ہے۔'' خواب گر سیاسی نیتا تمام باتیں سن کر کہنے لگا۔'' انہیں سمجھانے کی کوئی کارگرتر کیب نکالنی پڑے گی، تب ان کی عقل ٹھکانے پر آئے گی۔''

''ان لوگوں نے لوٹ مار کر کے ہمارے گھر کو بھی آگ لگادی۔'' حیدر علی کی بہن پرنم آنکھوں سے اپنی غم بھری کہانی سنا رہی تھی۔'' آپ کے جیجا جی ہاتھ جوڑ جوڑ کر ان

سے زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے لیکن انہیں آگ میں زندہ جلایا گیا اور میں اندھیرے کی آڑ میں وہاں سے بچوں کے ساتھ بھاگ آئی۔''

''اللہ پر بھروسہ رکھو۔'' حیدر علی اپنی غم زدہ بہن کو دلاسہ دینے لگا۔ ''میں کل ہی پولیس اسٹیشن میں رپوٹ درج کراؤں گا۔ بستی کے دوسرے لوگوں کا کیا حال ہے؟''

''ساری بستی پر قیامت سی ٹوٹ پڑی ہے۔'' وہ ہچکیاں لیتے ہوئے کہنے لگی۔ ''تمام لوگ وہاں سے بھاگ گئے ہیں۔''

''کیا تم وہاں پر موجود تھے؟'' پولیس افسر حیدر علی سے پوچھ بیٹھا۔

''نہیں جناب!'' حیدر علی نے جواب دیا۔ ''میں شانتی نگر میں رہتا ہوں۔ یہ فساد تو ہمارے گاؤں سے کئی کوس دور دوسرے گاؤں میں ہوا ہے۔ وہاں میری بہن رہتی ہے۔ اسی پر غم کا یہ آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔''

''کیا نام بتایا، حیدر علی؟'' پولیس افسر سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ''قانون اپنا کام جبھی صحیح طریقے سے کرسکتا ہے جب اس کے پاس ثبوت وشواہد موجود ہوں۔ تم اپنی بہن کو تھانے لے کر آو، ہم بیان لینے کے بعد ایف۔ آئی۔ آر درج کریں گے۔''

''لیکن جناب! آپ ایف آئی آر درج تو کرلیں۔'' میں انہیں بھی یہاں بیان دینے کے لئے پیش کروں گا۔''

''آپ سے جو کہا گیا وہ کرو، ہمیں قانون سکھانے کی کوشش مت کرو۔'' پولیس افسر تیور بدلتے ہوئے بول پڑا۔ ''چلے جاؤ یہاں سے اور کل بہن کو ساتھ لے آنا۔''

''ٹھہرو حیدر علی ٹھہرو۔'' چند لوگوں نے حیدر علی کو ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے روکا۔ ''تیز رفتار بائیک پر کہاں جارہے ہو؟''

''میں پولیس اسٹیشن سے لوٹ رہا ہوں۔'' حیدر علی نے بائیک سائیڈ میں کھڑی کرتے ہوئے کہا۔ ''اب گھر جارہا ہوں، لیکن آپ لوگ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟''

''ہم لوگ وہاں سے جان بچا کر بھاگ آئے ہیں۔'' ایک آدمی پھولتی سانس میں

بول پڑا۔ ''ساری بستی برباد ہوگئی۔ تمہاری دکان بھی جلادی گی اور تمہارے گھر والے!''

''گھر والے...!'' حیدر علی پریشان ہو کر پوچھ بیٹھا۔ ''کیا ہوا ان کو...؟''

''مت پوچھ حیدر علی مت پوچھ۔'' ایک اور ہمسایہ آنسو بہاتے بہاتے کہنے لگا۔ ''تم بھی ہمارے ساتھ بھاگ چلو۔''

''نہیں میں کیوں بھاگوں؟'' حیدر علی جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل تلاش کرنے لگا۔ ''او شِٹ! وہ تو چیکنگ کے دوران تھانے میں ہی رہ گیا۔''

''تو کیا ہم بھی تھانے میں رپوٹ درج کرائیں۔''

''نہیں۔'' حیدر علی مایوس لہجے میں بولا۔ ''وہاں جانے میں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

ایک خوفناک مانوس آواز چہار جانب سے گونج اٹھی۔ اس گونج سے تمام لوگوں کے اوسان خطا ہوگئے اور وہ حواس باختہ ہو کر بھاگنے لگے۔ حیدر علی بھی اپنی جان بچانے کے لئے بھاگنے لگا۔ ایک انجانا سا خوف اسے اپنی جنم بھومی سے بھاگنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ بھاگتا رہا، بھاگتا رہا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے بھاگنے کا یہ خوف اس کا تعاقب صدیوں سے کر رہا ہے۔ بھاگتے بھاگتے اس کا جسم تھکن سے چور ہو رہا تھا۔ وہ بھوکا پیاسا سارات کے اندھیرے میں شہر پہنچ گیا۔ دوڑتے دوڑتے اس کے پاؤں شل ہوگئے تھے۔ شہر کے اندر اس کے کئی پہچان والے لوگ تھے لیکن بدلتے ماحول کی زہرناکی نے اس کو اتنا خوف زدہ کیا تھا کہ وہ اندھیرے میں کسی گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت بھی نہ کر سکا تاکہ مصیبت کی اس گھڑی میں کہیں پر سر چھپا سکے۔

زور کا ڈنڈا پڑتے ہی وہ گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ خمار آلود آنکھوں سے اس نے اپنے آپ کو تین چار پولیس والوں کے گھیرے میں پایا۔ وہ تھوڑا سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔

''ادھر کیا کر رہا ہے؟'' ایک پولیس والا پوچھ بیٹھا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''حیدر علی۔'' وہ خوف زدہ ہو کر کہہ اٹھا۔

''تو ہماری انفارمیشن صحیح نکلی، ذرا اس کی تلاشی لو۔'' دوسرا پولیس اشارہ کر کے بولا

''کہیں کوئی دھماکہ کرنے تو نہیں آیا ہے۔''

''نہیں، یہ تو خالی ہے۔'' تلاشی لینے والا بٹوا پھینکتے ہوئے بول پڑا۔''اس کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔''

''ادھر مندر میں کیا کر رہا تھا؟''

''مندر؟' حیرت سے اس کے منہ سے نکل پڑا۔

''نہیں تو کیا یہ تمہارا لال قلعہ ہے؟'' پولیس والا طنز آمیز لہجے میں بول پڑا'' جہاں سے تم سارے دیش پر حکم چلاتے تھے۔''

''نہیں جناب، دراصل بات یہ ہے کہ میں کل رات کے وقت شہر پہنچا۔'' وہ معذرت خواہانہ لہجے میں کہنے لگا۔'' یہاں پر بہت سارے لوگوں کو سوتے دیکھ کر میں بھی یہاں سو گیا۔''

''سو گیا تو پھر یہاں کا مالک بنے گا؟'' ایک پولیس والا گردن پکڑ کر اُسے مندر سے باہر پھینکتے ہوئے بول پڑا۔'' وہیں جاؤ جہاں سے آئے ہو۔''

وہ دھڑام سے چوراہے پر گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی جیسے زمین پر زلزلہ سا آگیا۔ اپنے بکھرے وجود کو سمیٹتے ہوئے وہ سوچنے لگا:

''میں کہاں جاؤں..؟ یہی تو میری جنم بھومی ہے، یہی تو میرا وطن ہے، یہی تو شہید ٹیپو سلطان کا وطن ہے۔ اس مٹی سے تو ہماری وفا پرستی کی مہک آتی ہے۔ اگر کتّوں کی بھونک سے شیر اپنی کچھار سے بھاگے گا تو یہ اس کے بہادرانہ وجود کے منافی ہوگا۔ میں وطن کا وفادار ہوں، غدّار نہیں۔ میری وفاداری ہی ان غدّاروں کی ہار ہے۔''

یہ سوچتے سوچتے اس کے لڑکھڑاتے قدم منزل کی جانب بڑھنے لگے۔ خوف کی مانوس آواز چہار سو گونج رہی تھی.. لیکن.. وطن کی دھرتی کا سینہ اپنے وفادار پیڑ کی گہری جڑوں سے چوڑا ہو رہا تھا۔

OOO

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری

مابعد جدید دور کا نمائندہ افسانہ نگار

پروفیسر قدوس جاوید

اُردو میں شعر و ادب کی تخلیق دنیا کی نہ جانے کتنی بستیوں میں ہو رہی ہے، لیکن کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں کا امتیاز یہ ہے کہ وہ صرف ادب نہیں لکھتے، ادب کے حوالے سے اہم عصری تناظرات (Contemporary Context) کو جینے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور یہ تو ماننا ہوگا کہ ہر سچا قلم کار اپنے معاشرہ، اپنی ثقافت سے وابستہ رہ کر ہی پوری ایمانداری کے ساتھ اپنی زمین میں اپنے ادب کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ چناچہ کشمیر کے ادیب خواہ وہ کشمیری میں لکھتے ہوں یا اُردو میں یا پنجابی، پہاڑی، گوجری اور لداخی کسی بھی زبان میں، ان کی شناخت کا بنیادی نقطہ ہی یہ ہے کہ ان کی تحریروں سے کسی نہ کسی زاویے سے اپنی زمین اور تہذیب کی گنگناہٹ لازمی طور پر سنائی دیتی ہے۔ جب ہم کشمیر میں اُردو افسانہ کے مزاج کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نور شاہ، عمر مجید اور خالد حسین سے لے کر مشتاق مہدی، شیخ عبدالرشی، غلام نبی شاہد، ایثار کشمیری، ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی قادری، راجہ یوسف تک اور اس کے ساتھ کی نسل سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگار ریاض توحیدیؔ کے افسانوں میں بھی کشمیر کے عصری حالات و حقائق کو عمدہ فنی اور جمالیاتی دروبست کے ساتھ جینے کا عمل ملتا ہے۔ تاہم ریاض توحیدیؔ کی فکشن نگاری کا یہ پہلو بھی قابل ستائش ہے کہ ایک صاحب بصیرت

(Visionary) افسانہ نگار اور ناقد ہونے کی وجہ سے ان کے افسانوں میں صرف مقامی موضوعات کی کہانیاں نہیں ملتی ہیں بلکہ ان کے بیشتر افسانوں کا کینوس اتنا پھیلا ہوا ہے کہ ان میں عالمی سطح کے موضوعات و مسائل کو بڑی فنکاری اور دانشورانہ انداز سے موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے جس کی مثال ان کے پہلے مجموعے 'کالے پیڑوں کا جنگل' اور دوسرے مجموعے 'کالے دیوؤں کا سایہ' کے بیشتر افسانوں میں ملتی ہے۔ جیسے 'سفید ہاتھی'، 'سفید تابوت'، 'احتسابی جزیرہ'، 'تیسری جنگ عظیم سے قبل'، 'ہائی جیک' وغیرہ۔ یعنی ریاض توحیدی کے افسانوں میں جس طرح مقامی مسائل و موضوعات کو بڑی فنی چابکدستی سے برتا گیا ہے اسی طرح عالمی سطح کے موضوعات و مسائل پر بھی بڑی ہوشمندی سے ارتکاز کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں، ان کے چند اور افسانے 'جنت والی چابی'، 'سفید جنگ'، 'وفادار پیڑ'، 'تاج محل اور گئوشالہ' وغیرہ بھی اخبارات اور رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس طرح ان کے بیشتر افسانے مابعد جدید موضوعات کی خوبصورت عکاسی کرتے ہیں اور ادبی سطح پر ریاض توحیدی مابعد جدید دور کے ایک نمائندہ افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنا مقام متعین کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ریاض توحیدی ایک متحرک ادیب ہیں کیونکہ عصر حال تک ان کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں دو افسانوی مجموعوں کے علاوہ تحقیق و تنقید کی تین کتابیں 'جہانِ اقبال'، 'ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم بحیثیت اقبال شناس' اور 'معاصر اردو افسانہ... تفہیم و تجزیہ' (جلد اول) بھی شامل ہیں۔ ان میں 'معاصر اردو افسانہ تفہیم و تجزیہ' ایک اہم تنقیدی کتاب ہے کیونکہ اس میں زیادہ تر مابعد جدید دور کے افسانوں کا مطالعہ جدید تنقیدی تھیوریز کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔

ریاض توحیدی تخلیقی صلاحیتوں سے بھی مالا مال ہیں جس کا اظہار انہوں نے صنفِ افسانہ میں کمال پختگی کے ساتھ کیا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے 'کالے پیڑوں کا جنگل' (۲۰۱۱) اور 'کالے دیوؤں کا سایہ' (۲۰۱۴) میں شائع ہوئے ہیں، جن کی پذیرائی اُردو حلقے میں بڑے پیمانے پر ہوئی ہے۔ معروف نقاد پروفیسر حامدی کاشمیری

’کالے دیوؤں کا سایہ‘ کے پیش لفظ میں ریاض توحیدیؔ کی افسانہ نگاری کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’گردوپیش کے ماحول میں لوگوں کو جس ظلم وتشدد سے گزرنا پڑا ہے اس کی تصویریں ریاض توحیدی اپنے افسانوں میں پورے خلوص دردمندی اور دُکھ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ان پر حقیقت نگاری کا اسلوب حاوی نہیں، وہ جانتے ہیں کہ فن کے رموز کیا ہیں اور وہ ان کو اچھی طرح لفظوں میں منتقل کرتے ہیں۔ریاض توحیدی کو زبان وبیان پر پورا عبور حاصل ہے۔وہ افسانے کے واقعات کو بہت حد تک فرضیت میں مبدل کرتے ہیں اور یہی ان کی افسانہ نگاری کی پہچان ہے۔‘‘

خود ریاض توحیدی نے افسانہ میں حق گوئی پر مبنی سماجی وابستگی کو لازمی قرار دیا ہے۔اپنے مجموعے ’کالے دیوؤں کا سایہ‘ میں ’چند باتیں‘ کے عنوان سے صنف افسانہ اور اپنی افسانہ نگاری کے فکری اور تخلیقی رویوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’میں سمجھتا ہوں کہ جب ظالم کا تیشہ مظلوم کے ننگے بدن پر وار کرتا ہے تو وار سہتے سہتے مظلوم کے دل سے جو پر شور آواز نکلتی ہے وہ آواز ہمارے افسانوں میں بھی سنائی دینی چاہیے۔افسانے میں اشاروں، کنایوں میں بات کرنا تو ٹھیک ہے لیکن سچائی کو بیان کرتے ہوئے مصلحت پسندی سے کام لینا میری فطرت کے خلاف ہے کیونکہ میں لنگور کو انگور بنا کر پیش نہیں کرسکتا۔‘‘

’کالے پیڑوں کا جنگل‘ اور ’کالے دیوؤں کا سایہ‘ کے افسانوں کی درجہ ذیل فہرست سے ہی پتہ چلتا ہے کہ ان کے نام تک تخلیقی رچاؤ کے حامل ہیں:

’ماں‘، ’گلوبل جھوٹ‘، ’سنگ باز‘، ’احتسابی جزیرہ‘، ’گمشدہ سرمایہ‘، ’سفید ہاتھی‘، ’ناکہ بندی‘، ’جشنِ قبرستان‘، ’ببول کے کانٹے‘، ’ٹوٹتی جوانیاں‘، ’نشیب وفراز‘، ’قتل.. قاتل اور مقتول‘، ’مقبول‘، ’ڈپریشن‘، ’تیسری جنگ عظیم سے قبل‘، ’ہوم لینڈ‘، ’کشمیر نواز‘، ’کبھی الوداع نہ کہنا‘، ’اپنا سورج‘، ’مسائل کے یزید‘، ’کالے پیڑوں کا

جنگل، ’چھوڑ دو، ’ہائی جیک، ’ہاٹ اٹیک، ’’زندگی کا بازار، ’’کالے دیوؤں کا سایہ، ’’خوف، ’گمشدہ قبرستان، ’زہریلے ناخدا، ’سفید تابوت، ’بہشت کی پکار، ’’ناقوس واذان، ’جنازے، ’دمشن القدس، ’مینٹل ہاسپٹل، ’’دوشالہ، ’وطن کی عصمت، ’رحمت کے پھول، ’گلہ قصائی۔

ان افسانوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے موضوعات، کشمیر کی خوں آشام صورتحال سے لے کر عالمی سطح کے خونچکاں واقعات پر مشتمل ہیں اور سبھی افسانوں کا مرکز توجہ ظالم وجابر ہاتھوں کے کالے کارنامے ہیں۔اور مجموعوں کے ناموں میں کالے لفظوں کی معنویت یوں بھی اجاگر ہوتی ہے کہ قریباً سبھی افسانوں میں کسی نہ کسی صورت کوئی نہ کوئی کالا کردار موجود ہے ڈجس سے افسانہ نگار کی فنی اور لسانی اختراع سازی کی خوبی بھی سامنے آتی ہے، جیسے ’گلوبل جھوٹ، سفید ہاتھ، تیسری جنگ عظیم سے قبل، ناکہ بندی، جشن قبرستان، کالے دیوؤں کا سایہ، کالا چوہا وغیرہ افسانوں میں مقامی سطح سے لے کر عالمی سطح تک کی طاقتوں کا غاصبانہ کردار اور کالے کرتوت کی افسانوی منظر کشی۔ کوئی بھی باشعور تخلیق کار مقامی ماحول سے بے خبر ہو کر نہیں رہ سکتا اور اس کی تخلیق پر مقامی ماحول کے اثرات کسی نہ کسی صورت میں ضرور نظر آتے ہیں۔توحیدیؔ کے افسانوں میں بھی گلشن کشمیر میں رونما ہونے والے خونچکاں واقعات اور عبرتناک مظالم ومسائل کی تصویر کشی اس طرح کی گئی ہے کہ یہ افسانے، گزشتہ دو ڈھائی دہائیوں میں کشمیر اور کشمیریوں پر گزرنے والے عذاب کے زندہ اور متحرک مرقعے ثابت ہو رہے ہیں۔ان میں ’سنگ باز (مصلوب دھڑکنیں)‘ ناکہ بندی، ’جشن قبرستان، ہوم لینڈ، ’’کشمیر نواز، ’کالے پیڑوں کا جنگل، ’چھوڑ دو، ’کالے دیوؤں کا سایہ، ’گمشدہ قبرستان، ’بہشت کی پکار، ’ناقوس واذان، ’گلہ قصائی، جیسے افسانے شامل ہیں۔افسانہ ’’چھوڑ دو‘‘ میں کشمیر کے ان ہزاروں معصوم لوگوں کی بدنصیبی کی کہانی ستر سالہ ضعیف ’جبار چاچا‘ کے حوالے سے بیان کی گئی ہے جس کا اکلوتا نوجوان بیٹا نذیر خان اور اور اکلوتی نوجوان بیٹی شریفہ دونوں

اپنے اپنے خوابوں کے ساتھ ظلم کا شکار ہو کر موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جبار چاچا ان ہزاروں لوگوں کی طرح تنہائی کی زندگی جینے پر مجبور ہو جاتا ہے، جن کے بچے کو بے رحم ہاتھوں نے ابدی نیند سلا دیا۔

اسی طرح ''گلہ قصائی'' میں افسانہ نگار نے بدی اور خود غرضی (ڈاکٹر) اور انسانیت کے غلبہ کو ایک اَن پڑھ قصائی گلہ کے حوالے سے کہانی کا موضوع بنایا ہے اور افسانہ کے بین السطور سے یہ حقیقت جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے کہ وادی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے ذمہ دار افراد خصوصاً ڈاکٹر وغیرہ اب اپنے فرائض منصبی کے تئیں نہ تو مخلص رہے نہ ذمہ دار، جو کشمیر کی روایتی اخلاقی اور انسانی روایات کے یکسر خلاف ہے۔ لیکن کشمیر کا وہ طبقہ جنہیں ان پڑھ اور پست ذہن مانا جاتا ہے ان کے دلوں میں کشمیر کی قابل فخر انسان دوستی کے چراغ ابھی بھی روشن ہیں۔ اسی لئے گلہ قصائی ڈاکٹر کی خود غرضی کے سبب اپنی بیٹی کی موت کا انتقام ڈاکٹر کی بیٹی کو گوشت میں زہر ملا کر لینا چاہتا ہے، لیکن پھر اس پر اس کی نفسیات میں موجود انسانیت، اس کے انتقام کے وقتی جذبے پر حاوی ہو جاتی ہے اور وہ زہر ملا گوشت واپس لے کر ضائع کر دیتا ہے۔

دراصل کشمیر سے باہر کی دنیا کو آج بھی پوری طرح معلوم نہیں کہ اس چمن میں صیادوں نے گل و بلبل کے شکار کے لئے ایسے ایسے ہتھکنڈے استعمال کئے اور ایسی ایسی سازشیں رچی ہیں کہ کشمیر کے ایک طبقے کی سوچ اور فکر کی قوت جیسے سلب ہو کر رہ گئی ہے۔ اس اندوہناک صورت حال کی منظر کشی ''گمشدہ قبرستان'' اور ''خوف'' وغیرہ افسانوں میں دکھائی دیتی ہے۔

ریاض توحیدیؔ کے کلیدی افسانے ''کالے دیوؤں کا سایہ'' میں امن و شانتی قائم کرنے کے ذمہ دار افراد اور اداروں کی جانب سے عام لوگوں کے ساتھ ہونے والے وحشیانہ سلوک کو بڑی سچائی سے علامتی اسلوب میں پیش کیا گیا ہے اس افسانہ کے درج ذیل اقتباس پر غور کریں:

''پھاٹک کے سامنے مارے گئے کتوں کی بدبو سے جب کالے دیوتنگ آ گئے تو انہوں نے بستی کے لوگوں کو حکم جابری سنایا کہ وہ ان خون آلودہ کتوں کو اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر دور کسی نالے میں پھینک دیں۔ بے بس لوگ حکم جابری کی تعمیل کرتے ہوئے کتوں کو کاندھوں پر اُٹھائے جا رہے تھے کہ اچانک انہیں مردہ کتوں کے ڈھیر میں ایک خوبصورت نوجوان کی لاش پر نظر پڑی۔ وہ خوف زدہ ہو کر ڈھیر سے پیچھے ہٹنے لگے۔ انہیں پیچھے ہٹتے ہی کالے دیو آگ بگولہ ہو کر چلانے لگے:

''سالے..! پیچھے کیوں ہٹے..؟ ان کتوں کو جلدی جلدی یہاں سے ہٹاؤ، ہوا میں بدبو پھیل رہی ہے۔''

''ان... ان میں ایک انسانی لاش بھی ہے۔'' ایک نوجوان لرزتی آواز میں بول پڑا۔

''اُس کو بھی یہاں سے دفع کرو اور ان کتوں کے ساتھ کسی نالے میں ڈال دو۔'' کالی غار سے ایک طنز آمیز آواز آئی۔''

''لیکن...''

''سوال مت کرو، نہیں تو تو بھی کُتے کی موت مرے گا، سالا'' ایک اور خوفناک آواز نوجوان کے کانوں سے ٹکرائی۔''

ریاض توحیدی کے کئی افسانوں میں عالمی مسائل کی حیران کُن منظر کشی جلوہ گر ہے۔ ۱۱/۹ کے بعد عالمی منظرنامے پر رونما ہو رہے واقعات و حادثات کی تصویر کشی کرتے ہوئے موصوف ''سفید تابوت''، ''مشنِ القدّس''، ''تیسری جنگ عظیم سے قبل'' اور ''ہائی جیک'' جیسے افسانوں میں گہرے شعور اور وسیع مشاہدے کے بل پر تہذیبی تصادم کے سازشی محرکات کو علامتی اسلوب کے توسط سے ایکسپوز کرتے نظر آ رہے ہیں۔ افسانہ ''ہائی جیک'' میں ایک عام انسان کے نفسیاتی تناؤ کو سوچ کی ہائی جیک قرار دیتے ہوئے افسانہ نگار جمہوریت کی آڑ میں حیوانیت برپا کرنے والے چہروں کے پردے دلچسپ فن کاری سے چاک کرتے ہوئے ایک عام انسان کے جذبات کی فکر انگیز ترجمانی

کا حق بھی ادا کرتے ہیں:

''دن بھر کی مصروفیات سے تھک ہار کر وہ رات کی تنہائی میں سچ اور جھوٹ کی جنگ کا نظارہ کرنا چاہتا ہے۔ نیوز چینل کا نمبر ریموٹ پر دباتے ہی اسکرین پر فلیش نیوز آتی ہے:

''ڈرون کے حملے میں اسکول تباہ' درجنوں معصوم بچے موت کی آغوش میں۔''

''یہ دشت گردی ہے' حیوانیت کے شکار معصوم بچوں کے والدین کا احتجاج۔''

''نہیں.. یہ اقدام دنیا میں امن بحال کرنے کے لئے ضروری ہے۔'' سفیر امن کا بیان۔

''ایک خوفناک دھماکے میں نیٹو کے درجن بھر فوجی ہلاک۔''

''یہ دہشت گردی ہے۔'' سفیر امن کا بیان ''جمہوریت کے دشمنوں سے ضرور بدلہ لیا جائے گا۔''

تو اس افسانے میں عالمی طاقتوں کے انسان کش اقدامات اور جمہوریت کی آڑ میں دہشت گردی اور ان کے دہرے معیار کی انسانیت سوز پالسیوں کو علامتی اسلوب میں ایکسپوز کیا گیا ہے۔

ریاض توحیدی کے افسانوں کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ ان میں روایتی موضوعات کے برعکس مابعد جدید دور کے سیاسی' سماجی' معاشی اور گھریلوں مسائل و موضوعات کی فکر انگیز عکاسی کی گئی ہے' یعنی یہ عصری حسیت (Contemporary sensibility) کی فکشن تاریخ لگ رہے ہیں اور اسلوب میں بھی ایسی تازگی ہے کہ کسی بھی قاری کو متاثر کرنے کی کشش رکھتا ہے۔ افسانہ ''سفید کبوتر'' کا یہ اقتباس دیکھیں' جو ہمارے گرد و پیش کے گھٹن زدہ ماحول کی نہ صرف عکاسی کرتا ہے بلکہ اشاروں کنایوں میں افسانہ بہت کچھ سامنے لا رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ماب لینچنگ پر جتنے اہم افسانے لکھے گئے ہیں۔ کالی دھند اور سفید کبوتر'' بھی ان میں اپنی اہمیت برقرار رکھنے میں

کامیاب نظر آتا ہے۔

''دہشت ناک آواز سے سبھی لوگ نیند سے جاگ اُٹھے اور خوف زدہ ہو کر محسن خان کے کمرے میں جا کر سہم گئے۔ دہشت بھری آواز سے ان کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ محسن خان کا نوجوان بیٹا احسان خان دروازہ کھولنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا لیکن باپ اور دوسرے گھر والوں نے اسے روک لیا۔

سبھی لوگ سہم کر یہ سوچنے سے قاصر نظر آ رہے تھے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے...؟ خوف کی ہوائیں ابھی صحن میں ہی سائیں سائیں کر رہی تھیں کہ اچانک دہشت کے ناگ گھر کے اندر بھی گھس کر رینگنے لگے۔ ڈر کے مارے عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ خوف کا پھندا احسان خان کی گردن پر پڑتے ہی وحشت ناک آواز کمرے میں گونج اٹھی:

''اپنے تہوار پر حقوق حیوان کا خون کر کے ہمارے آدرشوں کا بھی خون کرتے ہو۔''

یہ سن کر احسان خان کا بزرگ باپ روتے بلکتے دہشت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے بول پڑا:

''ہم پر رحم کھاؤ، ہم نے تہوار میں کسی کے آدرشوں کا خون نہیں کیا ہے۔''

آدرش کا زہریلا ترشول برق رفتاری سے بزرگ محسن خان کے پیٹ میں گھس گیا اور پھول کو چمن سے جدا کر دیا۔ احسان خان یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر جونہی دہشت کے نرغے کو پھاند کر باپ کی پیٹ سے ترشول نکالنے لگا تو حقوق حیوان کی علمبردار تلوار نے انسانی ہاتھ کو بڑی بے رحمی سے کاٹ ڈالا اور ایک معصوم بیٹا بے ہوش ہو کر مظلوم والد کی لاش پر گر پڑا۔ دہشت کی آواز مخصوص اتہاس کے نعرے لگاتے ہوئی اندھیرے میں گُم ہو گئی۔''

(افسانہ: کالی دھند اور سفید کبوتر)

اسلوب کی بات کریں تو اسلوب کی دلکشی کسی بھی تخلیق کار کی شناخت بن جاتی ہے۔ ریاض توحیدی کا اسلوب بھی امتیاز کا حامل ہے۔ خصوصاً ان کا علامتی اسلوب اب اتنا جانا پہچانا لگتا ہے کہ چند علامتیں تو ان کی افسانوی پہچان بن گئیں ہیں: جیسے ’کالے دیو‘ سفید کبوتر‘ سفید نور‘ کوا اور کبوتر‘ کالے بھوت‘ کالے پیڑ‘ کالا چوہا‘ سفید ہاتھی‘ تاج محل اور گئوشالہ وغیرہ۔ تاہم ان کے علامتی افسانے پہیلی نما‘ گنجلک یا تجریدی ابہام کے حامل نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہ علامت کو بڑی فن کاری سے متن یا کہانی کا حصہ بناتے ہیں اور قاری‘ دوران قرأت تفہیم وترسیل سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ کیونکہ ان میں تخئیل آمیز تخلیقی برتاؤ ہوتا ہے اور ان کی اختراع کردہ علامتیں لسانی طور بھی اردو زبان کے اضافہ کا باعث بن رہی ہیں۔ ان کے علامتی افسانے پڑھ کر چارلس بودلئیر کی یہ بات یاد آتی ہے:

’’تاثرات کی تہہ میں جو ایک اساسی عالم چھپا ہوا ہے‘ اس کے رموز کا اظہار صرف علامتوں کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے۔‘‘

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری کو اُردو افسانہ کی روایت‘ شعریات اور موضوعاتی اور اسلوبیاتی رویوں پر نظر ہے۔ لہٰذا ان کو بھی اپنی سوچ اور فکر اور تخلیقیت کے سرمایہ کو نہ صرف محفوظ رکھنا ہے بلکہ اسے اور زیادہ مضبوط و مستحکم بھی کرنا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو صرف کشمیر ہی نہیں اُردو کی عام بستیوں میں بھی بحیثیت افسانہ نگار ریاض توحیدیؔ اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

(سابقہ صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی)

OOO

کوائف

نام : ڈاکٹر ریاض احمد بٹ
قلمی نام : ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری
پیدائش : یکم دسمبر 1973
موبائیل : 9906834877
ای میل : drreyaztawheedi777@yahoo.com
پتہ : وڑی پورہ ہندوارہ کشمیر 193221 (انڈیا)

تعلیم : گریجویشن 1999ء گورنمنٹ ڈگری کالج ہندوارہ
: ایم،اے (اردو) 2002ء شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی
: ایم،فل 2004ء اقبالؒ انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی
: پی،ایچ،ڈی 2007ء اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی

ایوارڈ : گولڈ میڈل ۲۰۰۷ء (اقبالیات)

تصانیف : جہان اقبالؒ (تحقیق،تنقید) 2010
کالے پیڑوں کا جنگل (افسانے) 2011
ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم بحیثیت اقبالؒ شناس (تحقیق وتنقید) 2013
دوسرا ایڈیشن عکس پبلی کیشنز پاکستان 2020
کالے دیوؤں کا سایہ (افسانے) 2014
معاصر اردو افسانہ تفہیم وتجزیہ جلد اول 2018 دوسرا ایڈیشن کتابی دنیا پاکستان 2021
معاصر اردو افسانہ تفہیم وتجزیہ جلد دوم 2023 عرشیہ پبلی کیشنز دہلی

ریاض توحیدی کشمیری کے افسانوں کی علامتی اور استعاراتی جڑیں

ڈاکٹر ریاض توحیدی کا تعلق کشمیر سے ہے۔ اسی لئے وہ اپنے نام کے ساتھ کشمیری کی اضافت بھی لگاتے ہیں۔ اردو شعروادب پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ اردو فکشن کے ایک اچھے ناقد تو ہیں ہی، اردو افسانہ کے ایک اچھے اور کامیاب تخلیقی فنکار بھی ہیں۔

ریاض توحیدی کے بیشتر افسانوں کا بیانیاتی فریم ورک حد درجے 'کامپیکٹ' اور 'اینڈ ٹو اینڈ' کے فن پر مبنی نظر آتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ چار یا پانچ صفحات پر مشتمل ان کے افسانے فن ایجاز نویسی کے عمدہ تخلیقی نمونے کی صورت میں دکھائی پڑتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ کہ افسانہ نگار کا علامتی اور استعاراتی طریقۂ اظہار ژولیدہ بیانی کی فلسفیانہ موشگافیوں سے پاک نظر آتا ہے۔ طریقۂ اظہار کا یہ فنّی رویّہ افسانہ نگار نے اس لئے اپنایا تا کہ قاری علامتوں کی مبہم پسندی میں گُم ہو کر نہ رہ جائے۔ آپ ان کے افسانے پڑھتے جائیں مجھے یقین ہے کہ افسانوں کی علامتی اور استعاراتی زبان سے مملو بیانیہ سے آپ کا تفہیمی شعور آزمائش میں مبتلا نہ ہوگا۔ مزید یہ کہ اشاروں اور کنایوں کے راستے جن مسائل و معاملات کا بیان ہوا ہے ان کی نزاکتوں کے پیش نظر معاملہ فہمی کے تخلیقی شعور کی کارفرمائیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

• اظہار خضر (پٹنہ، بہار)

Zindagi Ka Bazar (Short Stories)
by: Dr. Reyaz Tawheedi Kashmiri
Compiled by: Anwar Mirza
ISBN: 978-81-19889-51-8
Afsana Publications
Thane, India

ریاض توحیدی کشمیری کے افسانوں کی علامتی اور استعاراتی جڑیں

ڈاکٹر ریاض توحیدی کا تعلق کشمیر سے ہے۔ اسی لئے وہ اپنے نام کے ساتھ کشمیری کی اضافت بھی لگاتے ہیں۔ اردو شعر و ادب پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ اردو فکشن کے ایک اچھے ناقد تو ہیں ہی، اردو افسانہ کے ایک اچھے اور کامیاب تخلیقی فنکار بھی ہیں۔

ریاض توحیدی کے بیشتر افسانوں کا بیانیاتی فریم ورک حد درجہ 'کامپیکٹ' اور 'اینڈ ٹو اینڈ' کے فن پر مبنی نظر آتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ چار یا پانچ صفحات پر مشتمل ان کے افسانے فن ایجاز نویسی کے عمدہ تخلیقی نمونے کی صورت میں دکھائی پڑتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ کہ افسانہ نگار کا علامتی اور استعاراتی طریقۂ اظہار ژولیدہ بیانی کی فلسفیانہ موشگافیوں سے پاک نظر آتا ہے۔ طریقۂ اظہار کا یہ فنّی رویّہ افسانہ نگار نے اس لئے اپنایا تا کہ قاری علامتوں کی مبہم پسندی میں گُم ہو کر نہ رہ جائے۔ آپ ان کے افسانے پڑھتے جائیں مجھے یقین ہے کہ افسانوں کی علامتی اور استعاراتی زبان سے مملو بیانیہ سے آپ کا تفہیمی شعور آزمائش میں مبتلا نہ ہوگا۔ مزید یہ کہ اشاروں اور کنایوں کے راستے جن مسائل و معاملات کا بیان ہوا ہے ان کی نزاکتوں کے پیش نظر معاملہ فہمی کے تخلیقی شعور کی کارفرمائیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

• اظہار خضر (پٹنہ، بہار)

Zindagi Ka Bazar (Short Stories)
by: Dr. Reyaz Tawheedi Kashmiri
Compiled by: Anwar Mirza
ISBN: 978-81-19889-51-8
Afsana Publications
Thane, India